ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اس شمارے کے ساتھ
۲۳ مارچ کا خصوصی اسٹیکر
مفت حاصل کریں

مارچ ۱۹۹۰ء

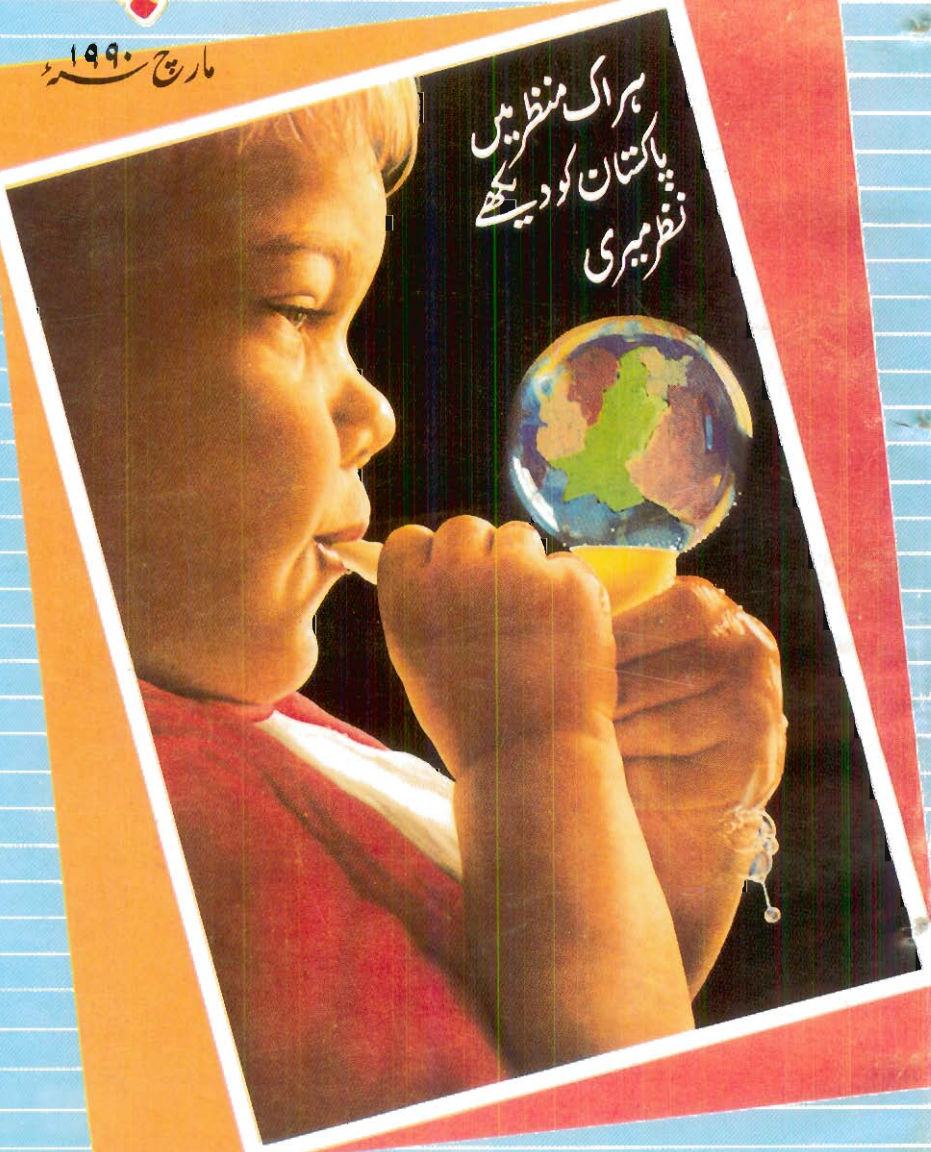

دنیا بھر میں آزمودہ
نیا
FRESHMINT + FLUORIDE
macleans
UNIQUE FORMULA for healthy teeth AND GUMS
MACLEANS CONTAINS A UNIQUE COMBINATION OF INGREDIENTS TO FIGHT DECAY AND PLAQUE, THE CAUSE OF GUM DISEASE.
Brushing regularly with Macleans helps give you and your family unbeatable protection for teeth and gums.
پلاک دور
PLAQUE FIGHTING
PA1
پلاک کیا ہے ؟
پلاک جراثیم کی چکنی تہہ ہے جو دانتوں کی سطح پر جم جاتی ہے۔ اگر اس کو دور نہ کریں تو اس کی وجہ سے دانتوں کو کیڑا لگتا ہے۔ پلاک مسوڑوں کی بیماری کا سبب ہے جس سے دانت گرتے ہیں۔
نیا میکلینس - پلاک سے حفاظت کے لئے دُنیا بھر میں آزمودہ۔
میکلینس نے مسوڑوں کی صحت کے لئے اپنے فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹ کے نئے منفرد فارمولے میں PA1 کا اضافہ کیا ہے۔ یہ خصوصی جراثیم کش جزو کلینیکل تجربات میں پلاک سے بچاؤ کے لئے آزمایا ہوا ہے، اور فلورائیڈ کیڑے سے حفاظت کے لئے مؤثر ہے۔
MILDMINT
macleans
FRESHMINT
macleans
FIGHTS DECAY • FIGHTS PLAQUE
پلاک دور۔
دانت مضبوط

NATIONAL UF(SF)01/90

سب سے اچھی چیونگ گم جوجو کی یہ ببل گم
لذّت کی لذّت
کھیل کا کھیل
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
مرکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول تجمل حسین چشتی
مشاورت مشفق خواجہ امجد اسلام امجد
مدیران اعزازی طاہر مسعود محمد سلیم مغل
مجلس ادارت شاہ نواز فاروقی ساجد سعید

فون ۲۹۹۱۷۸

جلد ۴ شمارہ ۹
مارچ ۱۹۹۰ء شوال ۱۴۱۰ھ

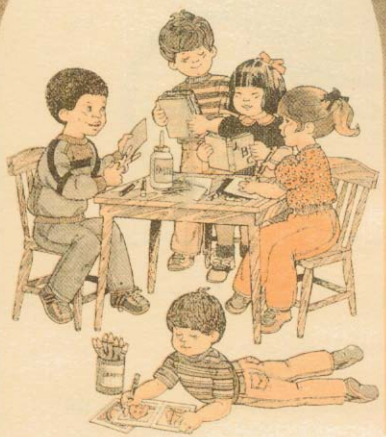

◉ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
◉ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا
◉ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضیاء الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا۔

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال
زرسالانہ کے لیے خصوصی پیکیج کا صفحہ دیکھیے

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ

۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰ روپے

رسالہ سال بھر تک منگوانے کے لئے دو طریقوں میں سے جسے مناسب اور احسن سمجھیں اختیار کریں۔

① زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

حسن ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
ڈاکیہ ڈاک لایا	....	۱۱
حارث کو کیا کرنا چاہئے۔	منیر احمد راشد	۱۴
چیزیں بھری پڑی ہیں عجب کائنات میں۔	سلمیٰ سلیم	۲۰
خوشی کہاں کھو گئی	شمع سرور	۲۳
کشمیر ہمارا (نظم)	شاہنواز فاروقی	۳۱
سائنس انکوائری	ایاز محمود	۳۳
کھٹ مٹھے	(منتخب لطائف)	۳۹
اجنبی	وحید احمد تبسم	۴۳
اگر سانپ ڈس لے	سید خورشید عالم	۴۷
مظلوم	حنا خیری	۵۱
نیا سورج	سلمان غزالی	۵۵
ضرب مومن	طاہر مسعود	۶۱
قحط	شبیر بیگ ناز	۷۰
پراسرار آدمی	عظمیٰ نسیم	۷۱
یہ دل کا معاملہ ہے	زہرہ	۷۷
نئی دنیا	فرزانہ روحی	۸۱
باسکرول کا شکاری کتّا	شاہنواز فاروقی	۸۷
دھاڑیل	نعیم بلوچ	۹۴
ہاکی	ساجد سعید	۱۰۱
انجانی مہم	م۔ا۔ راشد نیاوی	۱۰۷
غزل پزل	اسامہ بن سلیم	۱۱۶
لُوسی	شاہد جمیل	۱۱۹
ننھی نگارشات	....	۱۲۷
قلمی دوستی	....	۱۳۹
امی ابو کا صفحہ	....	۱۴۱

میدان عرفات میں لاکھوں آدمیوں کا ہجوم تھا اور یہ سب آہ و زاری اور توبہ میں مشغول تھے ان ہی میں ابراہیم بن ادھم کے پیر فضیل بن عیاضؒ موجود تھے، ہجوم اور توبہ و استغفار سے متاثر ہو کر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا

"اے اللہ اگر اتنا بڑا ہجوم کسی بخیل کے در پر کھڑے ہو کر اسی عجز اور درد و سوز سے گڑگڑائے تو وہ بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا اور تو جو الرحم الراحمین اور رحمت مجسّم ہے انہیں کس طرح اپنی عنایتوں اور اپنے کرم سے محروم رکھے گا۔"

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

اب سے آدھی صدی قبل کا ذکر ہے۔ مارچ کا یہی مہینہ تھا، مقام لاہور اور جگہ وہ تھی جہاں آج مینار پاکستان ہے۔ مینار تو بعد میں بنا تب یہاں لق ودق میدان تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ اس میدان میں منعقد ہوا تھا اور یہ عہد کیا گیا کہ مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بنائیں گے۔ ایک ایسا وطن جو ہندوؤں کے ظلم اور انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگا۔ مسلمانوں کی پناہ گاہ ہوگا جہاں مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہوں گے۔ اور اس ملک کو دنیا بھر کے لئے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کریں گے۔ یہ عہد ایک قرار داد کی صورت میں کیا گیا تھا اور اس کا نام بعد میں قرار داد پاکستان طے پایا تھا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ مسلمانوں نے جو عزم کیا ہے اسے وہ صرف سات سال کی مختصر مدت میں پورا کر دکھائیں گے۔ لیکن تاریخ کی آنکھوں نے یہ معجزہ بھی دیکھا اور مسلمانوں نے ثابت کیا کہ جب وہ کسی مقصد کے لئے متحد ہو جاتے ہیں تو خواب، حقیقت کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔

آج اس واقعے کو آدھی صدی گزر چکی ہے۔ مارچ کا یہی مہینہ ہے اور ملک وہی ہے جن کو قائم کرنے کا عزم کیا گیا تھا اور اس ملک کے ایک صوبے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ جھاڑیوں نالوں اور سڑکوں سے لاشیں مل رہی ہیں۔ جلی ہوئی لاشیں، کٹی پھٹی ہوئی لاشیں، تہذیب، انسانیت اور قانون کا دور دور تک سراغ نظر نہیں آتا۔ ہمیں اس سے دلچسپی نہیں کہ قتل ہونے والے کا تعلق کس سیاسی پارٹی سے ہے اور قتل کرنے والا کس جماعت کا رکن ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ وہ نسل ہے جس کے بزرگوں نے مینار پاکستان کے مقام پر ایک عہد کیا تھا۔ وہ عہد جسے ہم بھول گئے ہیں۔ جس کی خاطر ہم نے لاکھوں جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ اس کی حرمت کا ہمیں احساس بھی نہیں رہا۔ اے رب! ہم تجھ سے شرمندہ ہیں۔

ہم ٹکڑوں میں، گروہوں میں، پارٹیوں میں، عقیدے کے نام پر، زبان اور نسل کے نام پر بٹ گئے ہیں۔ منتشر ہوگئے ہیں۔ اب ہمیں ایک اور عہد کی ضرورت ہے۔ یہ عہد کہ اس خطہ پاک میں ہم مسلمان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچائیں گے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴	

یونائیٹڈ بک لینڈ سکھر

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

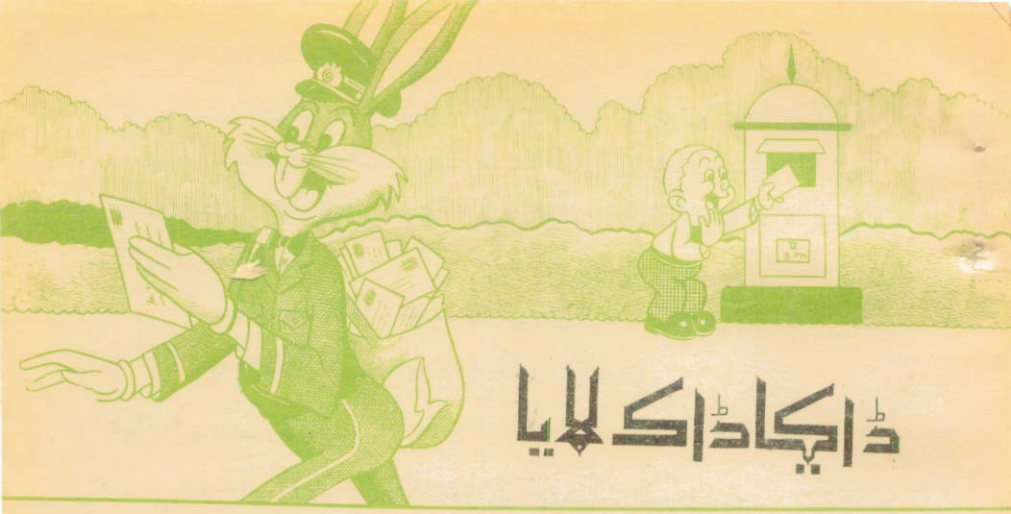

ڈبکا ڈاک لایا

تہمینہ رضا، لودھراں

رسالے کی قیمت نے ہمارے ابو کو حیران و پریشان کر دیا ہے۔ رسالہ ہم اپنے پیسوں سے خریدتے ہیں لیکن ابو ہمیں ڈانٹتے ہیں کہ دس روپے کی کتاب اتنی پتلی کیوں؟

سہیل احمد عباسی، سکھر

گنی چنی معلومات، میں غلطی سے لکھ دیا گیا ہے کہ تیز ترین سنچری کا اعزاز کلائیو لائیڈ کے پاس ہے جبکہ یہ اعزاز ویوین رچرڈز کے پاس ہے جس نے ۶۹ گیندوں پر سنچری بنائی تھی۔

رانا محمد طاؤس، سرگودھا

ایک لطیفہ بھیج رہا ہوں۔ آپ میرا لطیفہ پڑھ کر ضرور ہنسیں گے۔ اگر ہنسے نہ بھی تو مسکرائیں گے ضرور۔

جی ہاں پہلے ہم مسکرائے پھر ہنس پڑے۔

نیلوفر سجاد، پشاور

بھیا۔ ہم اور ہماری کزنز نے مل کر لڑکیوں کی بہبود کی ایک تنظیم بنائی ہے۔ میں اس کی صدر ہوں۔ اس تنظیم کا مقصد غریب لڑکیوں کو جن کے گھر میں مسائل ہوں اور جنھیں کڑھائی وغیرہ آتی ہو، ان کو ہم

لوگ اپنے خرچ پر دھاگہ اور کپڑے لادیتے ہیں۔ وہ لڑکی اس سے کوئی چیز بنادیتی ہے۔ جسے ہم مینا بازار لگا کر بیچ دیتے ہیں اور رقم اس لڑکی تک پہنچادیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کلب میں باحیثیت لوگ بھی شریک ہوں۔ واضح رہے کہ یہ کلب صرف لڑکیوں کے لئے ہے۔ اگر کوئی لڑکی اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر پارسل کر دے تو عنایت ہوگی۔ کوئی لڑکی ممبر بننا چاہے تو اس پتے پر خط لکھے: نیلوفر سجاد، معرفت سجاد احمد، ۱۵/۷۷ شاہی روڈ، پشاور کینٹ۔

آپ نے ایک نیک کام کا آغاز کیا ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے اور دوسروں کو اس سے سبق ملے۔ ہم نے آپ کا تقریباً پورا خط نقل کر دیا ہے۔ یہ بذات خود اشتہار ہے۔

عبدالروف عاقب، خانیوال

میں نے آپ کو کئی بار کہانیاں، دو دفعہ تعارفی کوپن سمیت اپنی تصویر بھی ارسال کی لیکن آپ نے انہیں اشاعت کے قابل نہ سمجھا۔ اگر آپ نے اس خط کو شائع کیا تو میں آئندہ خوبصورت کہانیاں، لطائف وغیرہ ضرور بھیجوں گا۔

شکیل احمد خان (؟)

رسالے کی رنگارنگی میں بے حد اضافہ ہوا ہے اور رسالہ خوبصورت ہو گیا ہے۔ لیکن کوئی نہ کوئی خامی رہ ہی جاتی ہے۔ مثلاً سالگرہ مبارک میں ماہ نومبر کے بجائے اکتوبر میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف چھاپ دیا گیا تھا۔

تہمینہ مقیم، بفرزون۔ کراچی

نومبر کے شمارے میں محمد جاوید خالد کا بی اماں پر مضمون نویں جماعت کی انگریزی کتاب سے نقل شدہ ہے۔

تاج الدین، مندوخیل

پچھلے مہینے آنکھ مچولی کے ایک ساتھی کو نصابی کتابوں کی ضرورت کے بارے میں خط چھپا تھا لیکن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ کون سی کلاس کی کتابیں انہیں چاہئیں۔ اگر ان کی کلاس کی کتابیں میرے پاس ہوئیں تو میں انہیں بھیج دوں گا۔

عبدالرحمٰن عاطف (؟)

اللہ کی مہربانی سے میں اسکول میں انتہائی محنتی، ذہین اور بااخلاق سمجھا جاتا ہوں اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہوں۔ آپ ذہین طلباء کو انعامات دیتے ہیں۔ کیا میں بھی اس کا حق دار بن سکتا ہوں۔ ہماری اسکالر شپ اسکیم کی قرعہ اندازی میں اگر آپ کا نام آجائے تو یقیناً آپ بھی اس کے حق دار ہوں گے۔

افتخار احمد آزاد، تحصیل کھاریاں

بہت سے ساتھیوں نے آنکھ مچولی کی قیمت پر اعتراض کیا ہے۔ ان لوگوں کو میرا جواب یہ ہے کہ آپ دوسرے رسالے پڑھ کر دیکھیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کوا کالا ہے یا سفید۔

ظہور حسین انجم، ایاز آباد

پہلی دفعہ آپ کا چمکتا دمکتا رسالہ پڑھا۔ بہت افسوس ہوا کہ میں اس معیاری رسالے سے محروم رہا۔ خیر آئندہ سے میری یہ کوشش ہوگی کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔

فرحت کلثوم رائے، ٹنڈو آدم

میں نے بچپن ہی سے بچوں کے تقریباً تمام رسالے خریدے اور پڑھے مگر آنکھ مچولی کو سب سے بہتر اور اپنے معیار کے مطابق پایا۔

ممتاز علی سموں، ٹیاری

اس سے پہلے میں نے بہت سے رسالوں میں خطوط لکھے ہیں، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آنکھ مچولی میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے آپ لوگ مایوس نہیں کریں گے۔

محمد مسعود قریشی، اٹک

آپ رسالے کی قیمت کم کریں یا صفحات بڑھائیں۔ اگر حکومت کاغذ کی قیمت بڑھاتی ہے تو حکومت سے احتجاج کریں، رسالہ بند کر دیں ہمیں اتنا مہنگا کیوں دیتے ہیں؟

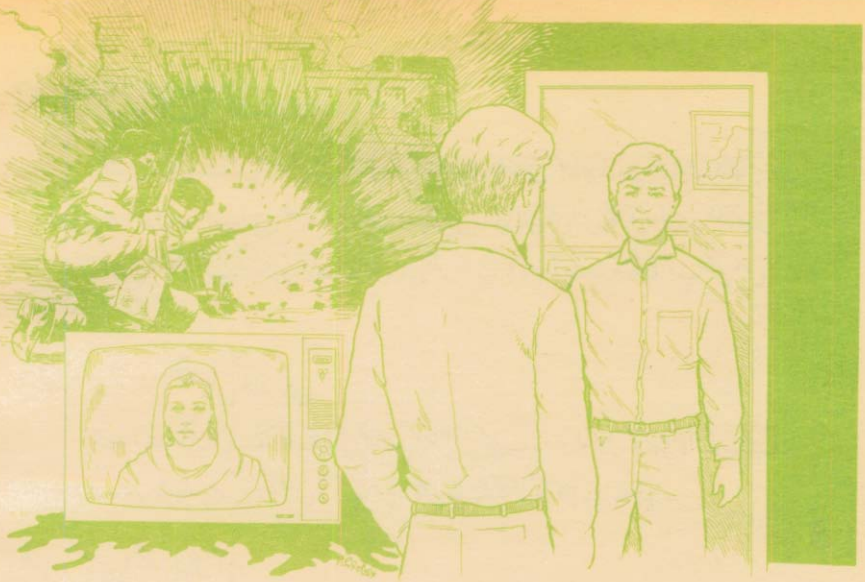

حارث کو کیا کرنا چاہیے

منیر احمد راشد

یوم پاکستان کے حوالے سے ایک خوبصورت کہانی

حارث گھنٹہ بھر سے آئینہ کے سامنے کھڑا تقریر کی ریہرسل کر رہا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر تھا اور کل اسے اپنے اسکول کے تقریری مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ تقریر کا موضوع تھا: "یوم پاکستان"۔ حارث کا پسندیدہ موضوع۔ اس بارے میں معلومات کا ذخیرہ اس کے دماغ میں پہلے سے موجود تھا۔ اور مزید حوالوں کے لئے وہ اسکول کی لائبریری اور محلے میں موجود ایک نیم سرکاری سی لائبریری سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے بڑی محنت سے اپنی تقریر تیار کی تھی۔

حارث عام طور پر تقریر میں ٹھوس معلومات کو خوبصورت الفاظ کا روپ دیتا اور پھر اپنے لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور چہرے کے تاثرات سے ان الفاظ میں حقیقت کا رنگ بھر دیتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ تقریر کو دہرا چکا تھا۔ حتیٰ کہ یہ اسے زبانی یاد ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ریہرسل کا آغاز کرتا،

امی کی پیار بھری آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔ وہ رات کے کھانے کے لئے بلا رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر سب اس کے منتظر تھے۔

"بھئی ماشاء اللہ، خوب تیاری ہو رہی ہے۔" باجی نے اسے دیکھتے ہیں فقرہ کسا۔

"مستقبل میں سیاستدان بننے کا ارادہ ہے کیا؟" بھائی جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی نہیں جناب! میں صرف ایک ٹیچر بنوں گا۔" حارث نے کہا اور کرسی گھسیٹ کر امی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران میں بھی بہن بھائیوں کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک چلتی رہی۔ کھانے کے بعد حارث حسب عادت ابو جان کے ساتھ چہل قدمی کرنے کے لئے نکل گیا۔ اس دوران بھی وہ ابو جان سے اسی موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔ جب یہ لوگ واپس گھر پہنچے تو رات کے نو بجنے والے تھے۔ ابو جان تو ٹی وی لاؤنج کی طرف چلے گئے جب کہ حارث ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں بند ہو گیا جو ٹی وی لاؤنج سے ملحق تھا۔

اب وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ بھرے مجمعے میں اسٹیج پر کھڑا ہے۔ وہ اپنی تقریر شروع کر چکا تھا اور آہستہ آہستہ اس کے الفاظ کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگ مبہوت تھے۔ لگتا تھا اس کا ایک ایک لفظ لوگوں کے دلوں میں اتر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جب انگریز کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس کے پاؤں ہندوستان کی سرزمین سے اکھڑ چکے ہیں۔ اب اس کا اقتدار زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے گا۔ اب اسے یہاں سے رخصت ہونا ہی پڑے گا۔ تو اس عیار دشمن نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ہندوؤں کو نوازنے کا پروگرام بنایا۔ مغربی جمہوری طرز حکومت پہلے ہی ہندوؤں کے حق میں تھا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ لہٰذا انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اقتدار انہی کو ملنے والا تھا۔ وہ خوش تھے۔ اور چاہتے تھے کہ تمام ملک پر ہندو راج قائم ہو جائے۔ اور ہندو راج قائم ہونے کا مطلب تھا کہ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ جہاں جہاں انہیں موقع ملا تھا۔ جہاں جہاں اقتدار نصیب ہوا تھا۔ وہاں وہاں انہوں نے اپنی فطری تنگ نظری اور ازلی مسلم دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ جہاں معیشت ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہاں مسلمان فاقوں مر رہے تھے، جہاں تعلیم ان کے ہاتھ میں تھی وہاں مسلمانوں کی نئی نسل کو علم سے دور رکھا جا رہا تھا۔ جہاں وہ اکثریت میں تھے۔ وہاں کے مسلمانوں پر ان کے رسم و رواج اور عقائد اثر انداز ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر ممکنہ طریقے سے،

جائز ہو یا ناجائز، ہندو مسلمانوں کو دبا دینا چاہتے تھے۔ کرش کر دینا چاہتے تھے، دوسری طرف حالت یہ تھی کہ مسلمان ایک عرصہ تک یہ ظلم و ستم برداشت کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے اور آمادۂ جنگ تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ مسلمان، اس کے باوجود کہ وہ صدیوں سے ہندوستان میں رہ رہے تھے، انہوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی۔ مگر اس تمام عرصہ میں کبھی بھی وہ اور ہندو ایک قالب میں نہ ڈھل سکے۔ وہ دو متوازی لکیروں کی طرح ہمیشہ الگ الگ رہے۔ ان کی الگ الگ اپنی پہچان تھی۔ ان کا الگ تشخص تھا۔ ان کی تہذیب جدا تھی۔ ثقافت جدا تھی۔ تاریخ مختلف تھی۔ رسم و رواج مختلف تھے۔ المختصر کہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں ہندو، مسلمانوں سے الگ تھے اور مسلمان ہندوؤں سے جدا۔ ہندو الگ سے ایک قوم تھے اور مسلمان الگ سے ایک قوم۔ یہ دونوں کبھی بھی مل کر نہیں رہ سکے تھے۔ اور نہ ہی رہ سکتے تھے، ان تمام حالات کے پیش نظر یہ چیز ناگزیر ہو چکی تھی کہ مسلمان اپنے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کرتے۔ جہاں وہ بحیثیت ایک قوم کے آزادانہ اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔" وہ تقریر کرتے کرتے ایک لمحے کے لئے رکا۔ ٹی وی لاؤنج سے نیوز ریڈر کی آواز آ رہی تھی:

"ایک ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان میں چار نہیں پانچ قومیں آباد ہیں۔ آج تک ہمیں بحیثیت ایک قوم کے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ اب ہم لوگ متحد ہو چکے ہیں اور انشاء اللہ اپنے حقوق کے حصول کی خاطر جان بھی دے دیں گے۔" ایک لمحے کے لئے حارث گڑبڑا گیا۔ خبر نامہ میں کسی سیاسی رہنما کا بیان دہرایا جا رہا تھا۔ حارث نے سر کو جھٹکا۔ اور اپنی تقریر کی ریہرسل جاری رکھی:

"ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر مسلمانوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ لاکھوں جانیں قربان ہوئیں۔ گھر جلے، عصمتیں لٹیں، لیکن پاکستان بن گیا۔ ہمارا پیارا وطن پاکستان۔ جہاں آج میں اور آپ نہایت آزادی سے، نہایت امن اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"چند نامعلوم افراد کی فائرنگ سے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے دس افراد ہلاک اور بائیس زخمی ہو گئے۔ واقع کی اطلاع پھیلتے ہیں لوگ مشتعل ہو کر اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور کئی گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے فوری طور پر غیر معینہ مدت کے لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ فوج کی بھاری جمعیت علاقے میں گشت کر رہی ہے تاہم صورت حال ابھی تک کشیدہ

ہے۔ "ایک مرتبہ پھر خبر نامہ نے اس کے خیالات منتشر کر دیئے تھے لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔ اور اپنی توجہ کو خبروں کی طرف سے ہٹا کر اپنی تقریر پر مرکوز کر لیا۔ لیکن اب اس کی آواز میں پہلا جیسا اعتماد نہ رہا تھا۔ الفاظ ہلکے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آج گھروں سے نکلتے ہوئے ہمیں یہ خوف نہیں ہوتا کہ کوئی ظالم ہندو ہمیں قتل کر دے گا۔ کوئی سکھ ڈاکو ہمارا مال لوٹ لے گا۔ کوئی دہشت پسند گروہ بلوہ کر کے ہمارے گھروں کو جلا دے گا۔ کوئی .....

"ایک اطلاع کے مطابق سندھ کے ایک گاؤں میں ڈاکوؤں کے ایک مسلح گروہ نے دھاوا بول دیا۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے متعدد افراد کو زخمی کر دیا، قیمتی اموال لوٹ لئے اور کھڑی فصلوں کو آگ لگادی۔ پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ لیکن تاحال کوئی گرفتاری عمل میں نہیں لائی جا سکی۔"

اس خبر نے تو حارث کو بالکل ہی پریشان کر کے رکھ دیا تھا وہ بار بار اپنی یاد کی ہوئی تقریر دہرانا چاہتا تھا۔ بار بار بھول جاتا تھا۔ اس نے کاغذ کو مضبوطی سے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں تھاما اور دیکھ کر تقریر پڑھنا شروع کر دی۔

"آج کا دن وہ دن ہے جب ہمارے بزرگوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ پاکستان حاصل کر کے رہیں گے۔ انہوں نے اپنا عہد پورا کیا۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس پاکستان کی حفاظت کریں۔ یہ نئی نسل کا کام ہے کہ وہ نہ صرف وطن کی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع کرے بلکہ اس کی نظریاتی سرحدوں کا بھی دفاع کرے۔"

وہ بلند آواز سے بول رہا تھا۔ لیکن خبریں پڑھنے والے کی آواز اس سے زیادہ بلند تھی۔

"کسٹم حکام نے سمگلنگ کی ایک کوشش ناکام بنادی۔ تفصیلات کے مطابق پی آئی اے کے ایک طیارے کے ذریعے کروڑوں روپے کا سونا چاندی اور قیمتی پتھر سمگل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی جسے کسٹم کے عملے نے ناکام بنادیا۔ سامان کو قبضے میں لے کر ایک شخص کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تحقیقات کے نتیجے میں چونکا دینے والے انکشافات ہوئے ہیں۔ ملزم نے چند ایسی اہم شخصیات کا نام بھی لیا ہے جو ملک کے انتہائی حساس عہدوں پر فائز ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ چند وزیروں کو بھی شامل تفتیش

کیا جائے گا۔"

اب تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی تھی۔ کاغذ حارث کے ہاتھ سے نکل کر اس کے قدموں جا پڑا تھا۔ وہ اپنی یاد کی ہوئی تقریر بالکل ہی بھول چکا تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا آئینے میں اس کا عکس نظر آرہا تھا۔ چہرہ پریشان، پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے عکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مسلمان ایک قوم نہیں، کیا پاکستان میں مختلف قومیں بستی ہیں۔ کیا ہم آزاد ہیں۔ کیا یہاں ہماری جان مال، عزت و آبرو محفوظ ہے؟ کیا ہم یہاں اطمینان و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ "نہیں" عکس نے جواب دیا۔

"تو خبر نامہ سچا ہے" حارث نے کہا۔

"ہاں خبر نامہ سچا ہے"

"تو کیا کتابیں جھوٹ بولتی ہیں۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ میں جھوٹا ہوں کیا؟" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"نہیں" تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔ کتابیں بھی سچی ہیں۔ تم بھی سچے ہو۔ مگر تمہارے الفاظ کھوکھلے ہیں۔ بے رنگ ہیں۔ بے جان ہیں۔ ان میں جان ڈالو۔ ان میں رنگ بھرو۔ حقیقت کا رنگ کیونکہ یہ تم ہی کر سکتے ہو۔ اور تمہارے جیسے لاکھوں نوجوان اور بچے ہی کر سکتے ہیں جنہیں اس ملک میں رہنا ہے، جنہیں یہیں جینا اور مرنا ہے۔ یہ ملک ان کا ہے یہ زمین ان کی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" حارث نے کہا۔

اگلے دن مقابلے کے دوران اس کی تقریر کا انداز بدلا ہوا تھا۔ اس کی تقریر رٹی ہوئی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا دل سے کہہ رہا تھا۔ آج اسے اپنے لہجے کو الفاظ سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بس وہ بول رہا تھا۔ جو اس کا دل کہہ رہا تھا۔ اور جب بات دل سے نکلتی ہے تو دلوں پر اثر کرتی ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ تقریر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے جا چکا تھا مگر مجمع پر ایک سکوت طاری تھا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ایک جانب سے کسی نے تالی بجائی تو لوگوں کو جیسے ہوش آگیا۔ ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔ اور فضا "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔

کس گناہ کی انہیں سزا دی ہے

ان کی حالت عجب بنا دی ہے

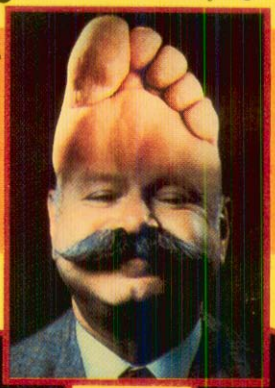

چہرہ تو میرا ٹھیک ہے انسان کی طرح
اک سر بنا دیا ہے حیوان کی طرح

منظر اور پس منظر کا سب حال میری آنکھوں میں ہے

سر پہ پاؤں کا محاورہ
سنا تو ہوگا
دیکھ بھی لیجئے

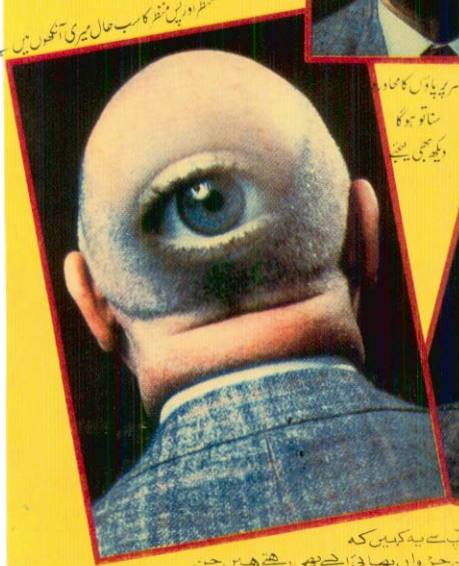

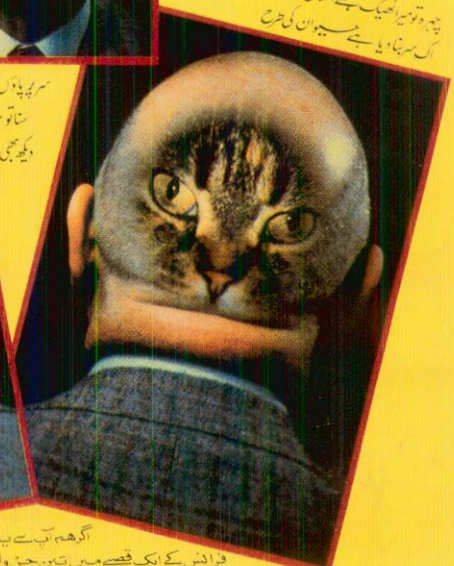

اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ
فرانس کے ایک قصبے میں تین جڑواں بھائی ایسے بھی رہتے ہیں جن
میں سے ایک کے سر پر پاؤں، دوسرے کی کھوپڑی بلی نما اور تیسرے کے سر
پر پیچھے کی جانب بڑی سی آنکھ ہے تو کیا آپ ہماری بات مان لیں گے ؟

اگر نہیں تو پھر آپ ہی بتایئے کہ یہ تینوں کون لوگ ہیں ؟

اگر آپ نہیں بتا سکے تو چلئے ہم بتا دیتے ہیں۔ یہ تینوں تصاویر ایک ذہین فوٹوگرافر کے کمال فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اپنی دُنیا عجیب دُنیا ہے

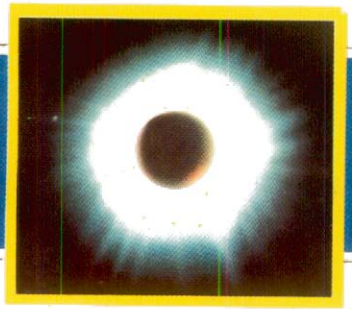

سُورج گرہن، مگر ذرا "وکھری ٹائپ" کا

ان چڑیوں سے سیکھے ہیں "فلیٹ" ہم نے بنانے

نہ ہوں میں زیبرا بچو، گدھا ہوں اور نہ گھوڑا ہوں
میں پورا کچھ نہیں ہوں پر سبھی کچھ تھوڑا تھوڑا ہوں

اک مچھلی "بے ہڈی" ایسی بھی جہاں میں ہے

پہاڑ سا اک ٹرک بنا کے وہ سوچتے ہیں کہ ہائے اللہ
کہاں سے لائیں سڑک وہ ایسی کہ جو ٹرک کو سہار لے گی

چیزیں بھری پڑی ہیں عجب کائنات میں

سلمیٰ سلیم

ہماری یہ کائنات بے شمار عجیب و غریب واقعات اور اشیاء کا گھر ہے۔ مثلاً یہ بات کتنی عجیب ہے کہ اس دنیا میں کتنے ہی جانور ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی نسل کے دیگر تمام جانوروں سے محبت کرتے ہیں اور اسی دنیا میں کتنے ہی ایسے انسان پائے جاتے ہیں جو اپنے ہی جیسے انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور پھر بھی بغیر کسی احساس گناہ کے مزے سے زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے سنا ہوگا کہ اب جاپان وغیرہ میں ایسے درخت اُگائے گئے ہیں جن میں ٹماٹر بھی اُگتے ہیں اور بینگن بھی۔ برابر کے صفحہ پر ہم آپ کو ایسے ہی چند عجیب و غریب قدرتی مظاہر سے متعارف کرا رہے ہیں۔

برابر کے صفحہ پر پہلی تصویر گرہن زدہ سورج کی ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے ناکہ مکمل سورج گرہن کے دوران ہمارے چند اماموں سورج اور زمین کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ جس کے باعث دنیا کے چند حصوں میں سورج دادا بالکل ایسے نظر آتے ہیں جیسے برابر کے صفحہ پر۔ اس سال کی ۲۶ فروری کو دنیا کے جنوبی اور مغربی خطوں کے رہنے والے مکمل سورج گرہن کا مشاہدہ کریں گے۔ (جو کہ کبھی کبھی ہوتا ہے) خیال ہے کہ امریکہ میں ۲۰۱۷ تک مکمل سورج گرہن نہیں دیکھا جاسکے گا۔ اور جناب یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے ناکہ نہ صرف گرہن زدہ سورج کو بلکہ عام سورج کو بھی براہ راست نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ اس سے بینائی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

اور ب یہ چڑیاں ایک بڑی عجیب و غریب عادت کی حامل ہوتی ہیں۔ افریقہ میں پائی جانے والی یہ چڑیاں جسامت میں تو ابابیل کی طرح ہوتی ہیں مگر یہ گھونسلے بناتی ہیں ۵ میٹر لمبے اور چوڑے۔ ایک گھونسلے میں عام طور پر ۱۰۰ چڑیاں رہتی ہیں (شاید فلیٹوں کا خیال کسی شخص کو انہی چڑیوں کے گھونسلے دیکھ کر آیا ہوگا؟) یہ چڑیاں مل کر گھر بناتی ہیں۔ گھونسلے میں ہر چڑیا کا اپنا جداگانہ کمرہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ گھونسلے اتنے بھاری ہوجاتے ہیں کہ وہ جس شاخ پر بنے ہوتے ہیں بوجھ کے مارے وہ شاخ ہی گر جاتی ہے۔ (گویا احمق انسان کی طرح یہ چڑیاں جس ڈال پر بیٹھتی ہیں اسی کو کاٹ دیتی

ہیں۔) ان میں سے بعض ایسی چڑیاں جو پیڑوں کی ڈالیوں کے ٹوٹنے کے تجربہ سے گزرتی ہیں وہ ٹیلی فون کے کھمبوں کو گھر بنانے کے لئے منتخب کرتی ہیں۔

اور یہ چار پیروں والا جانور بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ بھلا یہ ہے کیا؟ اب دیکھیں نا اس کا جسم تو گھوڑے سے ملتا جلتا ہے۔ مگر اس کی لمبی گردن سے لگتا ہے کہ یہ زرافہ کی نسل سے ہے اور اس کے پیروں پر پڑی ہوئی سفید پٹیاں کچھ اس طرح کا تاثر دے رہی ہیں جیسے یہ زیبرے کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ ان تینوں میں سے کسی بھی نسل سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس جانور کا نام "او کاپی" ہے اور یہ بھی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ بہت شرمیلا ہوتا ہے (بالکل آپ کی طرح) سائنس دانوں نے او کاپی کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں دیکھا تھا او کاپی صاحب شرمیلے پن کے باعث بہت کم اِدھر اُدھر نکلتے ہیں۔

آپ کے خیال میں تصویر نمبر چار بھلا کس چیز کی ہے؟ بظاہر تو یہ کسی ہوا بھری ہوئی پلاسٹک کی "گرہ" لگتی ہے۔ بھئی یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ گرہ ہے مگر پلاسٹک کی نہیں بلکہ مچھلی کی۔ یہ ایک HAG FISH ہے۔ یعنی ہیگ نام کی مچھلی۔ یہ مچھلی جب گندی ہوجاتی ہے تو یہ اپنے جسم کی گرہ بنالیتی ہے اور پھر سر سے لے کر دم تک اپنے آپ کو صاف کرنے لگتی ہے۔ ہیگ مچھلی کے چونکہ ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی اس لئے یہ بہ آسانی تڑمڑ سکتی ہے۔ یہ مچھلی سمندر کی تہہ میں پائی جاتی ہے۔

بھلا ہم میں سے کون ایسا ہے جو "کچرے" سے واقف نہیں۔ (دیکھئے یہ پڑھتے ہی سر مت کھجایئے آپ کے آس پاس موجود لوگ نہ جانے کیا سمجھیں) ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ کچرے سے کون واقف نہیں۔ یہ تو اب ہمارا قومی نشان بن چکا ہے۔ ہمارے گھر، ہماری سڑکیں غرضیکہ ہر جگہ کچرے سے سجی ہے۔ جناب یہ پانچویں شے ایک "سپر ٹرک" ہے جو کچرا اٹھانے کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ یہ ٹرک ایک وقت میں ۳۵۰ ٹن کچرا اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (اس سے اس کے پیٹ کی وسعت کا اندازہ کیجئے) اس ٹرک کا نام TEREX TITAN ہے۔ یہ ٹرک زمین سے پتھر اور مٹی ہٹانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ٹرک کان کنی میں بھی کام آتا ہے۔ یہ اتنا وزنی ہوتا ہے کہ عام سڑکیں اس کے وزن سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ اسے کانوں تک ٹکڑوں میں لے جایا جاتا ہے۔ اور پھر کام کی جگہ لے جاکر اسے جوڑ لیا جاتا ہے۔ اس طرح گویا یہ ٹرک کراچی کی سڑکوں کے لئے تو ہرگز مناسب نہیں۔ کیونکہ کراچی کی سڑکیں تو چار بوندوں سے اس طرح بننے لگتی ہیں جس طرح معمولی نزلے سے بچوں کی ناکیں بہنے لگتی ہیں۔

خوشی کہاں کھو گئی

شمع سرور

آج پھر شمع کا موڈ آف تھا۔ اسکول سے آتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے مگر شمع نے انہیں بہنے نہ دیا۔ اسی حالت میں وہ گھر پہنچی۔ گھر میں داخل ہوئی امی کو آہستگی سے سلام کیا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تو اس کی دادی آئی ہوئی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔

"ہائے دادی آپ کب آئیں؟" اس نے دادی کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بس بیٹی تھوڑی دیر ہوئی ہے آئے ہوئے۔ اور سناؤ ٹھیک تو ہو۔ ہاں مگر میں دیکھ رہی ہوں

کہ تمہاری صحت بہت گر گئی ہے" ۔ دادی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی امی درمیان میں بول پڑی۔ "امی جی میں تو ایک ہفتے سے اسے کہہ رہی ہوں کہ چلو ڈاکٹر کے پاس مگر یہ مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔" اس کی امی ابھی شاید بات جاری رکھتی کہ شمع کی باجی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ "دادی باتیں تو اب ہوتی رہیں گی پہلے چائے پی لیں، میں نے آپ کے لئے گرما گرم سموسے بھی بنائے ہیں۔"

باتوں باتوں میں وقت کا پتہ بھی نہ چلا اور اندھیرا ہونے لگا سورج ڈوب چکا تھا۔ دادی مغرب کی نماز کے بعد تسبیح پڑھنے میں مصروف تھی۔ شمع نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب کہیں کہیں شفق کی سرخی تھی۔ اس نے سوچا آج پھر ایک دن گزر گیا۔ مگر میرے لئے کوئی خوشی لائے بغیر سورج ڈوب چکا ہے۔ جانے سب لوگ خوش کیسے رہتے ہیں مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہوتی حالانکہ میں ہر دن کا آغاز اسی کے ساتھ کرتی ہوں کہ آج مجھے خوشی ضرور ملے گی۔ "شمع! شمع!" آواز سن کر چونکی۔ باجی اسے کسی کام سے بلا رہی تھیں۔

دادی اماں کو آئے ہوئے آج دوسرا ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ جس دن سے آئی تھیں اسی دن سے دیکھ رہی تھیں کہ باقی سب بچے تو بہت خوش ہیں مگر شمع ہر وقت چپ چپ سی رہتی ہے۔ کوئی بات پوچھو تو جواب دیتی ہے ورنہ چپ چاپ رہتی ہے۔ نہ پڑھائی میں دلچسپی نہ گھر کے کام میں نہ بہن بھائیوں میں اور نہ کسی مشغلے میں۔ ابتدا میں تو وہ سمجھیں کہ شاید شمع کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اس لئے مزاج ایسا ہو گیا مگر آہستہ آہستہ انہیں محسوس ہونے لگا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ سو انہوں نے اس گتھی کو سلجھانے کا تہیہ کر ہی لیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس لئے سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ شمع اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمسٹری کی کتاب تھی مگر توجہ کسی اور طرف تھی۔ "شمع! شمع بیٹی" اسے دادی کی آواز سنائی دی "جی! دادی" وہ اٹھ بیٹھی۔

"لیٹی رہو بیٹی۔" دادی نے اس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی سوئی نہیں ہو بیٹی۔"

"وہ دادی دراصل مجھے نیند نہیں آتی۔ اس لئے میں اکثر رات کو دیر تک جاگتی رہتی

ہوں۔ " شمع نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تو بیٹا اگر نیند نہیں آتی تو تم پڑھ لیا کرو۔ اس طرح تمہارا فائدہ بھی ہو گا اور دوسرے جب تمہاری آنکھیں تھکیں گی تو نیند بھی آجائے گی۔ " دادی نے اسے سمجھایا۔

"لیکن دادی میں تو دن میں نہیں پڑھ سکتی تو پھر رات کو تو میں تھکی ہوئی ہوتی ہوں کیسے پڑھوں " وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑی۔

"تو یہ بات ہے۔ مگر بیٹا تم پڑھ کیوں نہیں سکتی۔ تمہاری امی تو بتا رہی تھی کہ تم نویں کے سالانہ امتحان میں سیکنڈ آئی ہو۔ ایسے طالب علم تو پڑھائی میں بہت دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کی پوزیشن برقرار رہے۔ مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہی ہوں۔ دیکھو بیٹا اگر کوئی مسئلہ ہے کوئی پریشانی ہے مجھے بتاؤ میں تمہاری ماں جیسی ہوں۔ " مگر وہ چپ رہی۔ دادی نے پھر کہا۔

" دیکھو شمع بیٹی اگر تم اس مسئلے کو چھپا کر یہ سمجھ رہی ہو کہ تم یہ اچھا کر رہی ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تم اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہو۔ انور بتا رہا تھا کہ تمہارے ملہنہ ٹیسٹ اسی مہینے سے شروع ہو رہے ہیں اور میٹرک کا امتحان بھی کچھ مہینوں بعد ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر تم پڑھو گی نہیں تو اپنی پوزیشن کیسے برقرار رکھو گی۔ جلنے کڑھنے کی وجہ سے تمہاری صحت بھی خراب ہو رہی ہے۔ شاباش بتاؤ کیا مسئلہ ہے " ۔ دادی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔ شمع نے جو دادی کی شفقت دیکھی تو پگھل گئی۔ اور ساری بات دادی کے گوش گزارش کر دی۔ "بات یہ ہے کہ دادی اماں کہ میں خوش نہیں رہ سکتی۔ میں نے خوشی کو ہر کہیں ڈھونڈا مگر مجھے وہ نہ ملی۔ "

"مگر بیٹی اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی کوئی نہ کوئی واقعہ ہو گا کیونکہ پہلے تم ایسی نہ تھیں۔ " دادی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہاں دادی اماں ہاں! " پھر وہ پچھلے واقعات میں کھو سی گئی۔

☆☆

شمع کا شمار کلاس کی بہترین اور ذہین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی وہ اپنی صلاحیت کے مطابق حصہ لیتی۔ کلاس میں اس کا پانچ سہیلیوں کا ایک گروپ تھا۔ اس گروپ میں کلاس کی ذہین اور پوزیشن ہولڈر لڑکیاں شامل تھیں۔ پانچوں آپس میں بہت بے تکلف تھیں ہر بات کہہ

دیا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے سے محبت بھی بہت تھی۔ ان سب میں شمع بہت زیادہ حساس تھی اس لئے اسے ہر بات بہت محسوس ہوا کرتی تھی۔ باقی چاروں کے مقابلے میں وہ سانولی بھی تھی اور اس کا قد بھی چھوٹا تھا۔ اس بات کی اسے پہلے بالکل فکر نہ تھی مگر رفتہ رفتہ سہیلیوں کے احساس دلانے پر وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی۔ پہلے وہ زندہ دل اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ تقریروں، نعت خوانی، ڈراموں ہر مقابلے میں وہ موجود ہوتی۔ اس کی دوست بھی تمام مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں۔ کبھی وہ جیتی تھی کبھی کوئی اور۔ ان دنوں چودہ اگست کے مقابلے کی تیاریاں تھیں۔ شمع نے بھی تقریری مقابلے میں حصہ لیا ہوا تھا۔ انٹرول کے دوران اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ میں تمہیں تقریر سناتی ہوں تم میری غلطیاں نوٹ کرنا۔

اس کی دوست نورین نے مذاق سے کہا۔ "یار تقریر کی فکر بعد میں کرنا پہلے اپنے قد کی فکر کرو ڈائس تک کیسے پہنچو گی۔" ساتھ ہی سب کا قہقہہ بلند ہوا۔ اس وقت تو اس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا مگر بعد میں ۱۴ اگست کے مقابلے تک اس کے ذہن میں اس بات کا اثر رہا۔ اور بار بار یہ بات اس کے ذہن میں گونجتی رہی۔ جس دن مقابلہ تھا اس دن بھی بار بار اپنے قد کا موازنہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کرنے لگتی۔ جب اس کا نام پکارا گیا تو وہ ڈائس پر چلی آئی۔ چونکہ اس کا قد چھوٹا تھا اس لئے اس کے لئے چوکی رکھ دی گئی اس بات سے اس نے اتنا اثر لیا کہ تقریر کے دوران اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ سارے مجمع سے چھوٹی ہے جس کی وجہ سے وہ تقریر بھی ٹھیک طریقے سے نہ کر سکی۔ جس پر وہ اور دل برداشتہ ہوئی اور یہ بات سمجھنے لگی کہ وہ سب سے کمتر ہے۔ یہیں سے اس کے مزاج نے بھی بدلنا شروع کر دیا۔ پہلے طبیعت میں چڑچڑا پن آیا پھر وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ اس نے رسالوں میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی، ٹی وی کے پروگراموں کے ذریعے ذہن کو بہلایا مگر اسے سکون نہ ملا۔ نہ اس کا دل پڑھائی میں لگتا نہ دوستوں میں۔ گھر کے کام کاج میں تو وہ پہلے ہی دلچسپی کم لیتی تھی اب تو اور بھی دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ ایک ناکامی نے اور ایک اس احساس نے کہ اس کی شکل و صورت اچھی نہیں اسے اتنا دل برداشتہ کر دیا کہ وہ ہر کام سے بیزار ہو گئی۔ جب کبھی کوئی اس سے قد کے بارے میں کہتا کہ وہ ورزش کرے کہ اس کا قد بڑھے تو اسے اور برا لگتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ نہ اسے خوشی محسوس ہوتی نہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہونے کو دل چاہتا۔ پڑھائی میں بھی چونکہ دل نہ لگتا تھا اس لئے جب دسویں کے سہ ماہی امتحان ہوئے تو اس نے کوئی پوزیشن نہ لی۔ حالانکہ وہ چاہتی

تھی کہ وہ پڑھے مگر ایک ناکامی نے اس کو بالکل دل برداشتہ کر دیا کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔ کلاس کی کچھ لڑکیاں جو اس سے پہلے حسد کرتی تھیں۔ اب اس کی ناکامی پر خوش تھیں۔ اس کی چاروں سہیلیاں بھی اپنی دھن میں مگن مزے سے زندگی گزار رہی تھیں ایک وہ تھی کہ زندگی سے بیزار۔

☆☆

دادی نے اس کی ساری باتیں غور سے سنیں پھر انہوں نے شمع کے آنسو پونچھے اور کہا۔ "شمع بیٹی ناکامی تو کامیابی کا زینہ ہوتی ہے ضروری نہیں کہ انسان کو ہر موڑ پر کامیابی ہو۔ اگر انسان ایک بار ناکام ہو جائے تو اس کو دوبارہ کوشش کرنی چاہئے اور اس محرک کو ڈھونڈنا چاہئے جس کی وجہ سے اسے ناکامی ہوئی ہے۔ پھر اس عمل سے بچنا چاہئے جس کی وجہ سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ انسان کو ہر بار اس عزم کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے کہ اسے کامیابی ضرور ہوگی وہ تم نے ایک قول سنا ہی ہوگا کہ جسے ہارنے کا خوف ہوتا ہے وہ ضرور ہارتا ہے۔"

جہاں تک شکل وصورت اور قد وغیرہ کا معاملہ ہے تو وہ اللہ کی دی ہوئی چیز ہے۔ انسان کو اس پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ تمہیں ان لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہئے جو تمہارا مذاق اڑاتے ہوں بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت وشاں رہنا چاہئے۔ تمہیں اپنے قد کا احساس کرنے سے پہلے ان لوگوں کی طرف دیکھنا چاہئے جو کہ معذور ہیں جو ان نعمتوں سے محروم ہیں جو اللہ نے تمہیں دی ہیں۔ تم خود سوچو کہ اگر تمہارا قد خوب اونچا ہوتا تم خوبصورت ہوتیں مگر تم اندھی ہوتیں اس خوب صورت دنیا کو نہ دیکھ سکتیں یا تم بہری یا گونگی ہوتیں تب تمہاری ایسی اچھی صورت کا یا قد کا کیا فائدہ ہوتا۔ یاد رکھو شمع بیٹی دنیا میں کوئی شخص بھی اپنی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ اس دنیا میں وہی شخص خوش رہ سکتا ہے پر سکون رہ سکتا ہے جو اپنی صلاحیت سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہے۔ اگر تم خوش رہنا چاہتی ہوں تو اپنے دکھوں اور محرومیوں کی طرف نہ دیکھو۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو تم سے زیادہ دکھی ہیں جنہیں تمہاری ضرورت ہے۔ سن رہی ہو نا شمع بیٹی۔ دادی اسے آہستہ آہستہ سمجھا رہی تھی۔ کل سے تم میرے کہنے پر عمل کرو پھر تم دیکھو گی کہ تمہارے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ خوشی کبھی کھوتی نہیں یہ ہمارے آس پاس موجود رہتی ہے۔ بس اس کو سمیٹنے کا فن انسان کو آتا ہو۔ اب تم سو جاؤ اور ہاں جہاں تک تمہارے دوستوں کا تعلق ہے اگر وہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں تو تم تنہا بہتر ہو۔ گھر میں تمہارے چھوٹے بہن بھائی ہیں امی، ابو باجی سب ہیں تم ان سے دوستی کرو۔ کسی ایسے شخص سے کرو جو مخلص ہو۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ کل فجر کی

نماز کے بعد تم میرے کمرے میں آنا" یہ کہہ کر دادی اماں اٹھ گئیں شمع نے انہیں شب بخیر کہا۔ اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر سے بوجھ اتر گیا ہو اس نے دادی کی باتوں پر غور کیا "واقعی مجھے تو کوئی دکھ نہیں۔ آج سے میں اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیئوں گی۔" اس عزم کو دہراتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گی۔

☆☆

صبح جب وہ جاگی تو اس نے محسوس کیا کہ بہت دنوں کے بعد اسے ٹھیک سے نیند آئی ہو۔ اس نے وضو کیا نماز پڑھی۔ پھر دادی کے کمرے میں چلی آئی۔ دادی نماز سے فارغ ہو کر اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ "آؤ میری چاند!" دادی اماں اس کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"صبح بخیر دادی اماں!" اس نے دادی کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

"صبح بخیر بیٹی جیتی رہو۔ خوش رہو آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو۔ تم نے یقیناً میری باتوں پر غور کیا ہوگا۔ لیکن صرف غور کرنے سے کچھ نہ ہوگا اصل چیز تو عمل ہے اگر انسان صرف سوچتا رہے اور عمل نہ کرے تو فائدہ؟"

"جی دادی اماں مجھے معلوم ہے آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے" شمع نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تمہیں اپنے لئے ایک ٹائم ٹیبل بنانا ہوگا۔ اور پھر اس پر سختی سے عمل کرنا ہوگا۔ پڑھائی کے علاوہ گھر والوں کے لئے اور اپنی تفریح کے لئے بھی وقت نکالنا ہوگا فارغ اوقات میں تم ایسے مشاغل اختیار کرو جس سے تمہیں بھی فائدہ ہو اور کسی دوسرے کی مدد بھی ہو سکے، اور ہاں آج ہی سے صبح کے وقت ورزش شروع کر دو۔ اس سے تمہاری صحت بھی اچھی رہے گی اور پورا دن بھی ہشاش بشاش گزرے گا۔ اب تم بڑی ہو رہی ہو اس لئے گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لو۔ امی کے ساتھ باورچی خانہ بھی سنبھالو اور باجی سے سلائی بھی سیکھو۔ اگر تم ان باتوں پر عمل کرو گی تو تم دیکھنا کہ تم اس طرح خوش نہیں رہ سکتی۔ اور ہاں اگر تم سچی خوشی حاصل کرنا چاہتی ہو تو دوسروں کی مدد کو اپنا شیوہ بنالو یہی سچی خوشی کا حقیقی راستہ ہے۔ اب تم جاؤ اور آج سے نہیں ابھی اور اسی وقت سے ان باتوں پر عمل شروع کرو اگر تم کامیاب ہونا چاہتی ہو۔ یہ نہیں کہ تم کہو کہ آج نہیں کل سے اس بات پر عمل کروں گی۔" جاؤ شاباش دادی نے اسے پورا پروگرام سمجھاتے ہوئے رخصت کر دیا۔

شمع نے اسی صبح سے اس ٹائم ٹیبل پر عمل کیا جس کا خاکہ دادی اماں نے اسے دیا تھا۔ اس نے صبح کے وقت باجی کے ساتھ ناشتہ تیار کرنے میں مدد دی۔ پھر اسکول کے لئے تیار ہوئی۔ اسکول میں

بھی اس نے پورا دن صرف پڑھائی کی طرف توجہ دی کیونکہ اب اس کے سامنے ایک مقصد تھا کہ اسے کچھ کر کے دکھانا ہے۔ اور کوئی ایسا کام کرنا ہے جس سے لوگ اسے ہمیشہ یاد رکھیں اور خدا بھی خوش ہو اور اس کا دل بھی مطمئن ہو کہ وہ جس مقصد کے لئے اسکول آتی ہے وہ پورا ہو گیا۔ اسکول سے واپسی پر اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اور کھانا کھانے کے بعد اخبار کا مطالعہ کیا پھر کچھ دیر بہن بھائیوں کے ساتھ گپ شپ لگائی۔ پہلی دفعہ شام کی چائے اس نے اپنے ہاتھ سے سب کو بنا کر پلائی جس پر امی بھی اس سے بہت خوش ہوئیں اور اسے دعا دی۔ یہ دعا سن کر اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر کسی نے خوشی بھر دی ہو۔ پھر اس نے اسکول کا کام کیا۔ چھ بجے تک وہ کام کرتی رہی اس کے بعد اس نے ٹی وی دیکھا۔ مغرب کی نماز اس نے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی۔ اور اللہ سے اپنی کامیابی کے لئے سچے دل سے دعا مانگی۔ رات کو اس نے باجی کے ساتھ ملکر دسترخوان بچھانے اور اٹھانے میں مدد کی، برتن دھوئے پھر امی ابو اور سب بہن بھائیوں کے ساتھ ملکر باتیں کیں اور پروگرام کے مطابق رات نو بجے اپنے کمرے میں آکر اسکول کا باقی کام مکمل کیا۔ سونے سے پہلے اس نے نماز پڑھی۔ اور کچھ دیر اس کتاب کا مطالعہ بھی کیا جو وہ اسکول کی لائبریری سے لائی تھی۔ پھر وہ سکون کی نیند سو گئی۔ وہ آج بہت خوش تھی بہت پرسکون۔ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ کوئی دباؤ نہ تھا۔ اور اس کا اندازہ اس کے سوتے ہوئے پرسکون چہرے سے لگایا جا سکتا تھا۔

☆☆

پیاری دادی جان!

السلام علیکم! آج آپ کو گئے ہوئے دوسرا مہینہ ہو گیا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد میں نے آپ کی باتوں پر عمل کیا۔ ہر وہ کام کیا جس کا آپ نے مجھے کہا تھا۔ سچی خوشی اور حقیقی سکون حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے جیب خرچ میں سے ہر مہینے کچھ رقم ان لوگوں پر خرچ کرنی شروع کی جن کو اس کی ضرورت تھی اور آج میں جتنی پرسکون اور جتنی خوش ہوں۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں یہ خوشی حاصل ہے۔ مجھے خط لکھنے میں کچھ دیر ہو گئی مگر میرا اب آپ سے وعدہ ہے کہ آپ کو ہر ہفتے باقاعدگی سے خط لکھوں گی۔ اچھا دادی اماں اب اجازت دیں ٹائم ٹیبل کے مطابق میرا پڑھنے کا وقت ہو رہا ہے چچا اور چچی کو سلام۔ سلمی اور منی کو پیار

والسلام
آپ کی بیٹی
شمع مسرور

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر موذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ــــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھیئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔
قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

کشمیر ہمارا

شاہنواز فاروقی

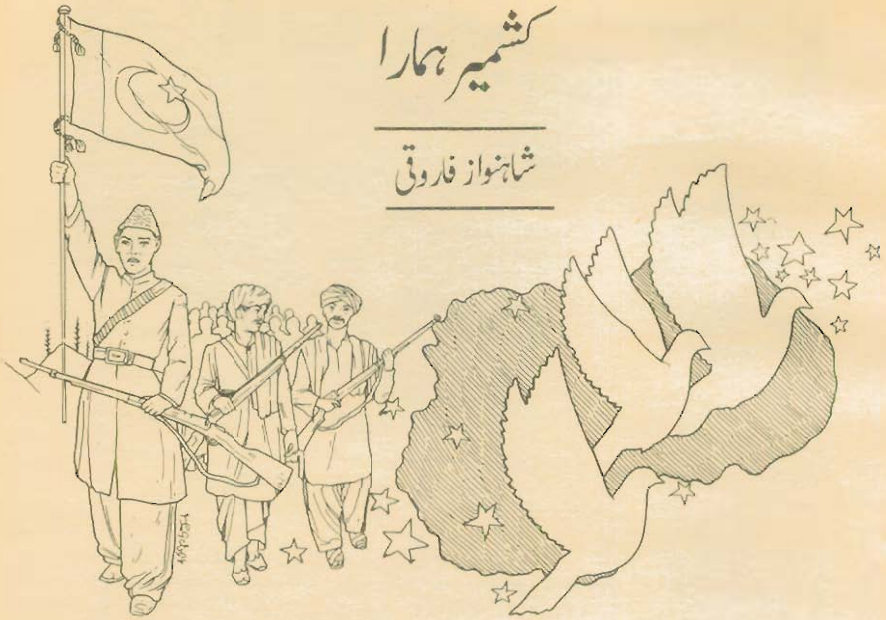

یہ ظلم کی دیوار کے گرنے کی صدی ہے
ابلیس کے افکار کے مرنے کی صدی ہے
اس بار بدل جائے گا تاریخ کا دھارا
ہو جائے گا ، ہوجائے گا کشمیر ہمارا
اِس بار ہیں اُس پار کے انداز نرالے
ہوجائیں گے منہ بھارتی افواج کے کالے
یہ بات فقط میرے لبوں پر ہی نہیں ہے
یہ بات، تو اِس بار ہَوا نے بھی کہی ہے
موقع ہے کہ بھارت سے حساب لپنا چکائیں
اس خطّے کی ہم اک نئی تاریخ بنائیں

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ؐ ۔ سیرتِ طیبہؐ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفرنامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۶ کہنا بڑوں کا مانو تعمیرِ سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶۔ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

سائنس انکوائری

ایاز محمود

◆ اسکائی لیب کیا چیز ہے اور یہ کس کام آتی ہے وضاحت کریں؟

نسیم انور، ٹوبہ ٹیک سنگھ

آپ نے اسکائی لیب کا ذکر کر کے گذرے ہوئے دنوں کی خوب یاد دلائی۔ آج سے تقریباً ساڑھے گیارہ سال پہلے کا ذکر ہے کہ جب اسکائی لیب کے ذکر نے تمام دنیا کو خوف و ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

اسکائی لیب دراصل ایک خلائی تجربہ خانے کا مخصوص نام تھا۔ جو ۱۹۷۳ء میں زمین سے بالائی فضاء میں بھیجا گیا تھا۔ ۱۱۴ فٹ لانبا اور ۸۵ ٹن وزنی اسکائی لیب تب سے زمین کے مدار میں مسلسل گردش کر رہا تھا۔

خلاء میں اس تجربے خانے کا قیام، کائناتی علوم سے آگہی اور خلائی سفر سے متعلق سوالات کے جواب حاصل کرنے کی جانب ایک نہایت اہم قدم تھا۔ اس میں مختلف تجربات کی سہولت حاصل تھی۔ مثلاً خلاء میں جرثوموں کی پیداوار اور افزائش پودوں کے بڑھنے کی رفتار اور اسی نوع کے دیگر طبی تجربات کئے گئے۔ اس کے علاوہ یہاں سے زمین کا تفصیلی مشاہدہ بھی کیا گیا جس کے نتیجے میں بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں۔ اس تجربہ گاہ میں سائنسدانوں نے مختلف اوقات میں تجربات کئے۔ اور اُن کے نتائج زمین کو بھیجتے رہے۔

اسکائی لیب چند فنی نقائص کی وجہ سے اپنے لئے توانائی فراہم کرنے سے معذور ہو گیا۔ اور نتیجے کے طور پر اپنے مدار کو برقرار نہ رکھ سکا اور آہستہ آہستہ زمین کی طرف گرنا شروع ہو گیا۔ سائنس دانوں نے بہت کوشش کی کہ یہ کسی طرح اپنے پرانے مدار میں واپس چلا جائے لیکن بے سود

اس وقت پر تھوڑے عرصے کے لئے ہی قابو پایا جا سکا۔ اور تجربہ خانہ ایک مرتبہ پھر اپنا مدار چھوڑ کر کشش ثقل کے اصول کے تحت زمین کی طرف آنے لگا۔

بس پھر کیا تھا۔ ایک افراتفری کا عالم ہوگیا۔ اخبارات ریڈیو، ٹیلیویژن اور تمام مواصلاتی ذرائع چیخ چیخ کے لوگوں کو خبردار کرنے لگے کہ اسکائی لیب سروں پر گرا ہی چاہتا ہے۔ خیال تھا کہ اس کے ٹکڑے انسانی آبادی پر گرے تو بہت تباہی ہوگی۔ جو کہ ایٹم بم کی ہلاکت خیزی سے کم نہ ہوگی۔

سائنسدانوں کی مسلسل کوششوں سے اس پر کسی حد تک قابو پایا گیا اور زمین کی فضا میں داخل ہونے کے بعد اُسے ایسی جگہوں پر گرنے دیا گیا جو سمندر اور غیر آباد خشکی کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ یہ جولائی ۱۹۷۹ء کی بات ہے۔

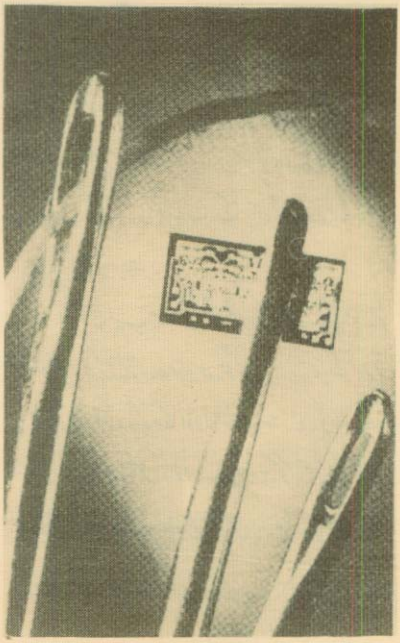

سائنس کا کمال

ایک جدید اور مختصر ترین الیکٹرانک سرکٹ جسے سوئی کے ناکے سے گزارا جاسکتا ہے

چاند کیوں کر چمکتا ہے ؟

محمد مظہر ہاشمی، شالیمار ٹاؤن، لاہور۔

چاند کی روشنی جسے چاندنی کہتے ہیں۔ ہمیشہ سے شاعروں کی من پسند رہی ہے۔ پورے چاند کی روشنی اپنے اندر ایک سکون بخش احساس رکھتی ہے جس سے بچے بڑے سب ہی لُطف اندوز ہوتے ہیں، مگر یہ چاندنی ہے کیا ؟ چاند کیونکر چمکتا ہے ؟

ان سوالوں کا جواب جاننے کے لئے ہمیں پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا کہ چاند ہماری زمین کا ایک سیارچہ ہے جو زمین کے گرد اپنے مدار میں اس طرح گردش کر رہا ہے کہ ایک چکر پورا کرنے میں اُسے ۲۹½ دن لگ جاتے ہیں۔ اس عرصے بعد وہ پھر اسی جگہ نمودار ہوتا ہے جہاں وہ اُس وقت سے تقریباً ایک مہینے پہلے نظر آیا تھا۔ اسلامی یا قمری مہینوں کا حساب اسی طرح رکھا جاتا ہے۔

چاند پر ہَوا ہے نہ پانی۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی روشنی بھی اپنی نہیں۔ چاند دراصل سورج کی روشنی کو ہم تک منعکس کرتا ہے۔

کیا زمین کے علاوہ بھی کسی اور سیارے پر کسی قسم کی مخلوق آباد ہے ؟

محمد فیصل۔ نیو کراچی

بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات میں انسان سے زیادہ ذہین مخلوق بھی موجود ہے جو دیگر سیاروں پر بستی ہے۔ اُڑن طشتریاں دراصل اُن کے

ہوائی جہاز ہیں۔ جن میں بیٹھ کر یہ مخلوق کبھی کبھار ہماری دُنیا کی سیر کو آتی ہے۔ ہمیں تو یہ سب باتیں خیالی باتیں لگتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کوئی سائنسی توجیہہ نہیں اور نہ ہی ان کے وجُود کے بارے میں ٹھوس اور واضح ثبوت ہیں۔ زیادہ تر سُنی سنائی باتیں ہیں۔ یا پھر اکا دُکا لوگوں کے مشاہدات ہیں جنہیں ہم فریبِ نظر بھی کہہ سکتے ہیں لہٰذا اس امکانی حقیقت کو سائنسی اعتبار سے کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں۔

دوسری جانب اس خیال سے مکمل طور پر انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر زندگی اپنی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ جہاں تک ہمارے نظامِ شمسی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اب خاصی معلومات حاصل ہیں اور ان معلومات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہاں کسی قسم کی زندگی کا کوئی سراغ نہیں۔ لیکن ہمارا نظامِ شمسی تو کائنات کی بے پایاں وسعتوں میں ایک ننھا سا سلسلہ ہے اور اسی لحاظ سے خلا اور کائنات کے بارے میں ہمارے علوم نہایت محدود ہیں اور یہ کائنات بھی ابھی مکمل کہاں ہے۔ سائنسدانوں کا مقبولِ عام نظریہ تو یہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیلاؤ کے عمل میں ہے۔ علامہ اقبالؒ کا شعر۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

اس بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کے سوال کا کوئی حتمی جواب دینا کس قدر ناممکن ہے۔

ریڈیو کے میڈیم ویو اور شارٹ ویو کے بارے میں بتائیں؟ ظہور حسین انجم کھرل۔ ملتان

ریڈیائی لہریں ہوا کے دوش پر نشریات کو ہم تک پہنچاتی ہیں۔ میڈیم ویو اور شارٹ ویو مختلف طول موج رکھنے والی ریڈیائی لہریں ہیں جن کی وساطت سے ہم ریڈیو کے پروگرامات سُنتے ہیں۔

میڈیم ویو یا درمیانہ طول موج رکھنے والی لہریں زمین کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار RANGE عموماً بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ دوسری جانب شارٹ ویو یا چھوٹی طول موج کی لہروں کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا ہے جہاں وہ آئینہ نما سطحوں سے منعکس ہو کر زمین کی طرف واپس آتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے اور دُور دراز کی نشریات ہم تک شارٹ ویو کے ذریعے ہی پہنچتی ہیں۔

آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی بتاتے چلیں کہ ٹیلیویژن VERY HIGH FREQUENCY V.H.F یا ULTRA HIGH FREQUENCY U.H.F پر ہی چل سکتا ہے۔ میڈیم ویو اور شارٹ ویو اس کے کسی کام کی نہیں۔

جن بچوں کے ذہن میں ریڈیائی لہروں کا تصوّر واضح نہیں ہے وہ اس کو یوں سمجھیں کہ ریڈیائی لہریں تصویر یا آواز کے لئے سواری کا کام کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سائیکل، بس، رکشہ وغیرہ آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ مغربی ممالک میں پرانی گاڑیوں کو توڑ کر ان سے نئی گاڑیاں تیار کر لی جاتی ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ تفصیل سے بتایئے۔

(ام زلیخا سبزواری ..... کراچی)

ترقی یافتہ ممالک میں فی کس آمدنی اور عمومی معیار زندگی اتنا بلند ہے کہ وہاں پرانی اور حادثہ شدہ گاڑیوں کا اس کے علاوہ کوئی اور مصرف نہیں کہ انہیں کوڑے کی طرح نا قابل استعمال قرار دے دیا جائے۔ لیکن بعض لوگوں کے لئے یہی کوڑا کباڑ نہایت قیمتی ہے کہ وہ اس میں سے اپنے کام کی چیزیں حاصل کر کے انہیں دوبارہ کار آمد بناتے ہیں۔

یہ کام کسی چھوٹے موٹے پیمانے پر نہیں ہوتا۔ صرف امریکہ ہی میں ہر سال تقریباً اسی لاکھ مسترد شدہ پرانی گاڑیاں دھاتوں کے حصول کے لئے توڑ دی جاتی ہیں۔ بڑی بڑی مشینیں گاڑی کو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں توڑ پھوڑ کر کر لوہے کے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ دوسرے مرحلے میں نہایت طاقتور مقناطیسوں کے ذریعے دھات کے ٹکڑوں کو الگ کر لیا جاتا ہے جس کے بعد انہیں بھٹیوں میں پگھلایا جاتا ہے۔ پگھلے ہوئے مادے کو ایک خاص عمل کے ذریعے ٹھنڈا کر کے باریک سفوف میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

اب اس باریک سفوف کو سانچوں میں ڈھال کر شدید دباؤ کے تحت مطلوبہ طرز میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ ڈھلے ہوئے حصوں کو مزید مضبوطی کے لئے انہیں ایک خاص درجہ حرارت تک تپش فراہم کی جاتی ہے

نئی گاڑیوں کے بہت سے حصے اسی طریقہ کار سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ یہاں ایک طرف تو وسائل اور توانائی کی بے شمار بچت ہوتی ہے دوسری طرف ماحولیات کی آلودگی کا بہت بڑا مسئلہ بھی کسی قدر حل ہوتا ہے۔

کار سے بیکار تک، بیکار سے پھر کار تک
کس قدر دلچسپ ہیں یہ سب مناظر دیکھ لو

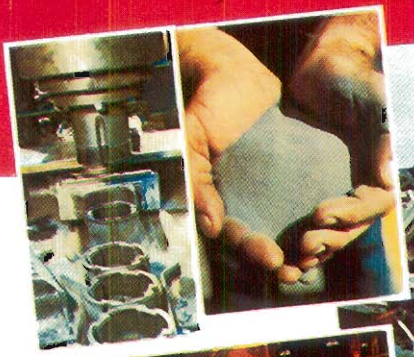

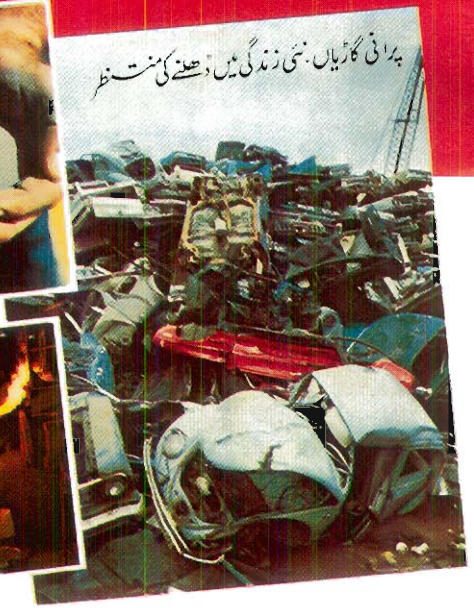

پرانی گاڑیاں نئی زندگی میں ڈھلنے کی منتظر

پرانی کاریں مختلف مراحل سے گزر کر فولادی سفوف بن گئیں

فولادی سفوف سے پھر ایک نئی اور حسین کار نے جنم لیا۔

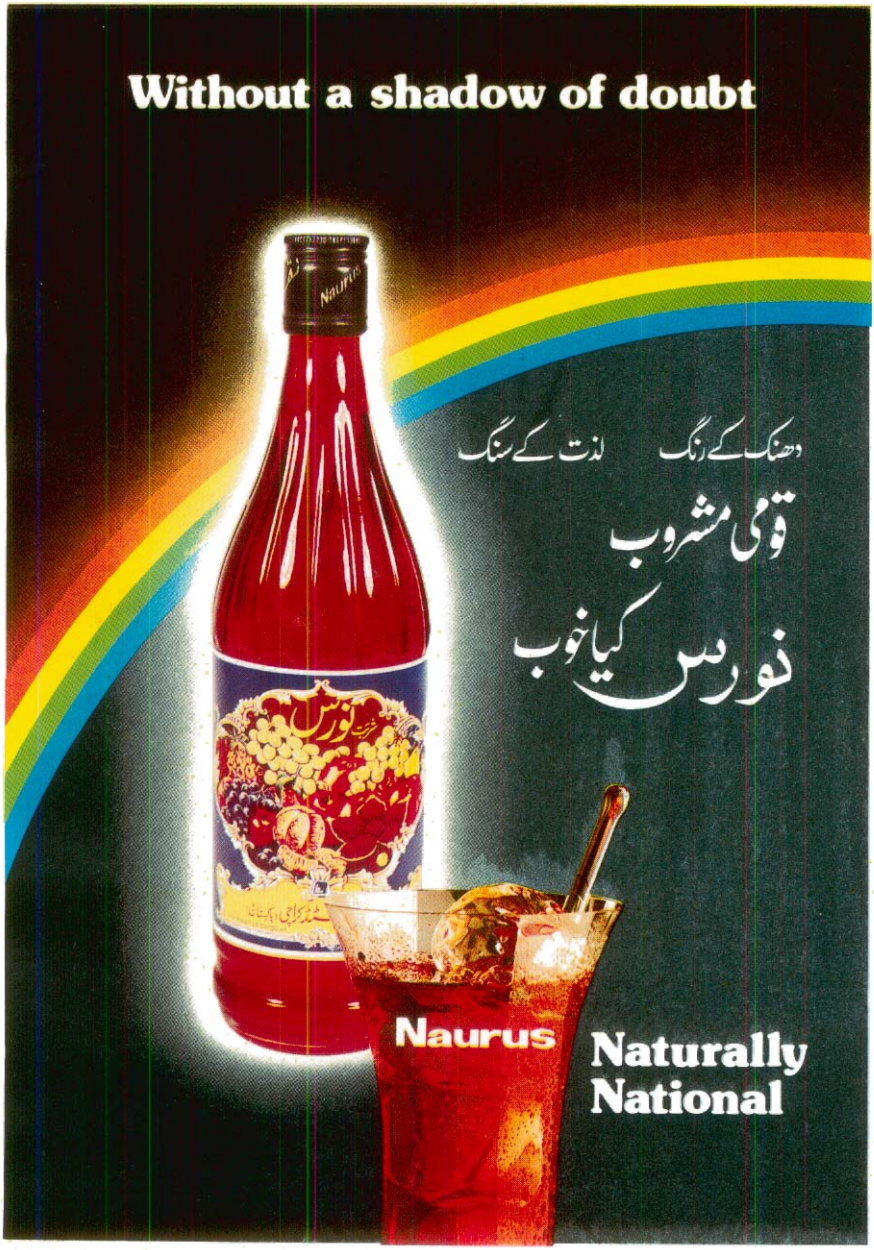

Without a shadow of doubt
دھنک کے رنگ لذت کے سنگ
قومی مشروب
نورس کیا خوب
Naurus
Naturally National

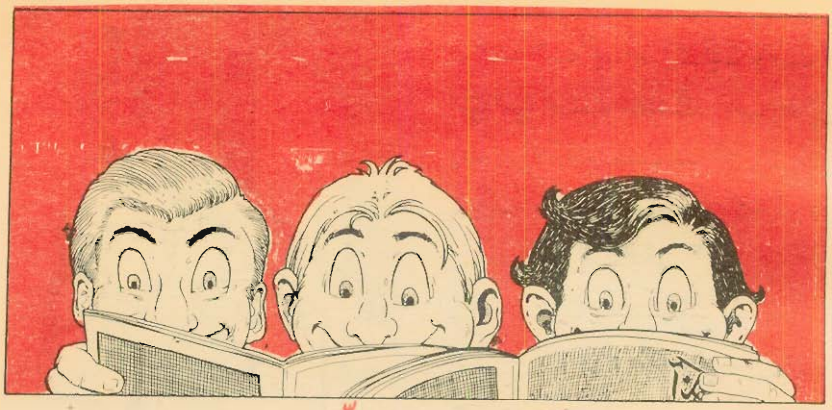

کھٹے میٹھے

ماہِ رواں کے منتخب لطائف

لطیفہ

ایک عورت چڑیا گھر میں ایک پنجرے کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی "میرے پیارے چیتے تمہاری کھال کتنی خوبصورت ہے۔ اگر تمہارے منہ میں زبان ہوتی تو تم اپنی خوبصورتی بیان کرتے اور کہتے" ...... درمیان میں بات کاٹ کر ایک تماشائی بولا "یہی کہتا کہ میں شیر ہوں چیتا نہیں۔"

نامعلوم

ایک ٹرانسپورٹر کو اس بات پر بے حد ناز تھا کہ اس کی گاڑیاں دن رات چلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا جب اُس نے اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی کے نئے دفتر کا افتتاح کیا تو وہاں یہ بورڈ خاص طور سے لگوایا "چوہدری نورالدین ٹرانسپورٹ کمپنی، ہم فخریہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں سوتے" کسی ستم ظریف نے چند روز بعد اس تحریر میں یہ اضافہ کر دیا۔ "اور نہ پڑوسیوں کو سونے دیتے ہیں۔"

اورنگ زیب سدھانڈی۔ چکوال

ماں: "ہائے عامر! تم نے کیچڑ میں تمام کپڑے خراب کر لیے ہیں۔"

عامر: "امی! کیا کرتا، گرتے وقت کپڑے اُتارنے کی فرصت نہیں ملی۔"

محمد لیٰسین۔ ملتان

انگریزی کے مشہور ادیب برنارڈ شا سے ایک صحافی نے پوچھا: "آپ کی لمبی عمر کا راز کیا ہے؟ انہوں نے کہا "میں سر ٹھنڈا اور پیر گرم رکھتا ہوں" صحافی نے اُن کا قول اخبار میں شائع کر دیا۔ لوگوں نے عمر بڑھانے کے لیے سر پر برف رکھنا اور پاؤں سینکنا شروع کر دیے اس سے لوگ نمونیہ اور بخار کا شکار ہونے لگے۔

ایک ہفتہ بعد ایک احتجاجی جلوس برنارڈ شاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ برنارڈ شاہ نے کہا

"بے وقوفو! سر ٹھنڈا رکھنے سے مراد تھی کہ مجھے کبھی غصہ نہیں آتا اور پاؤں گرم کا مطلب یہ تھا کہ میں ہمیشہ پیدل چلتا ہوں"

محمد اکرم سیالکوی ، ننکانہ صاحب

دو جیب کترے ایک جگہ بیٹھے ایک دوسرے کو اپنے اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔ جب پہلا اپنی بات کہہ چکا تو دوسرے نے کہا۔ "آج میں بس میں ایک آدمی کے قریب بیٹھا تو اس کا بٹوا خود بخود گر گیا۔ جسے میں نے اٹھا لیا۔"

پہلا:۔ "اس میں سے کتنے پیسے نکلے؟۔"

دوسرا:۔ "وہ خالی تھا اور جب میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو وہ کٹ چکی تھی۔"

محمد مشتاق ...... لالہ رخ واہ کینٹ

دو افراد ایک چھوٹی سی الماری کو زینے کے ذریعے اوپری منزل پر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں وہ پسینہ پسینہ ہو گئے مگر الماری ایک سیڑھی بھی اوپر نہ چڑھ سکی۔ کچھ دیر بعد ان میں سے ایک بولا۔

"ہم اسے ہرگز اوپر نہیں لے جا سکتے"

"اوپر" دوسرے شخص نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا اسے نیچے لے جانا ہے"

(نامعلوم)

ایک دوست (دوسرے سے) "سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنے والد کو امتحان میں فیل ہونے کی اطلاع کیسے دیتے ہو۔؟"

دوسرا دوست: "کوئی مشکل بات نہیں میں کہہ دیتا ہوں کہ نتیجہ آگیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے"

فرقان جمیل ۔ روشن باغ کراچی

مریض: "ڈاکٹر صاحب، یہ آپ نے کیسے دانت لگا دیے۔ تھوڑا سا کھانا کھاتے ہی باہر نکل آتے ہیں۔"

ڈاکٹر: "لیکن بھئی، میں نے کھانا کھانے کے لیے تو نہیں لگائے تھے۔"

مریض۔ (حیران ہو کر) "تو پھر ڈاکٹر صاحب؟"

ڈاکٹر۔ "ہنسنے کے لیے لگائے تھے۔"

سید شاھد احمد رضوی۔ گلشن اقبال کراچی

ایک آدمی کو بہت سے لوگ پیٹتے جا رہے تھے لیکن وہ ہنستے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لوگ اُسے مار کر چلے گئے تو پاس کھڑے دوسرے افراد نے اُس سے کہا۔

" وہ لوگ آپ کو پیٹ رہے تھے اور آپ ہنسے جارہے تھے۔ کیوں؟"

وہ آدمی مُسکرا کر کہنے لگا "اس لیے کہ وہ جس آدمی کو مارنا چاہ رہے تھے وہ میں نہیں تھا۔"

شاھد ظفر۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی

ایک آدمی کے ہاں اُس کا دوست آیا۔ وہ شخص اپنے دوست کو پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنے بیٹے کو اُس کے پاس باتیں کرنے کے لیے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے دوست نے لڑکے سے کہا "جاؤ اپنے ابا جان کو یہاں بھیج دو۔ جو کام وہ کر رہے ہیں وہ تم کرو۔" لڑکے نے باپ کو بھیج دیا اور خود باہر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنے والد کے دوست کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ آخر کار جب اس کا دوست جانے لگا تو اُس نے دیکھا کہ میزبان کا وہی لڑکا باہر چارپائی پر بیٹھا اُسے بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ اُس نے لڑکے سے پوچھا

"تم مجھے بُرا بھلا کیوں کہہ رہے ہو۔؟"

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا: ابا جو کام کر رہے ہیں وہ تم کرو۔" لڑکے نے جواب دیا۔

مرسلہ:۔ عروج ناصر۔ پشاور شہر

ایک مزدور کام کرتے کرتے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور کہہ دیا کہ "مر گیا ہے۔" لوگ اُسے چارپائی پر ڈال کر قبرستان کی طرف لے چلے اتنے میں اُسے ہوش آگیا اور وہ تڑپ کر اُٹھا اور چلا کر بولا "ارے میں تو زندہ ہوں مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

"چپ رہو تم ڈاکٹر سے زیادہ عقل مند نہیں ہو۔"

اُن لوگوں میں ایک آدمی نے کہا۔

حنان بیری، کراچی

ایک دن علامہ اقبالؒ سے ایک شخص ملنے آیا۔ وہ شخص مسلسل باتیں ہی کئے جارہا تھا علامہ حقے کی نے منہ سے لگائے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ شخص کہنے لگا، "معلوم ہوتا ہے آپ حقہ پینے کے عادی ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

اقبال مسکرائے اور بولے، "لیکن حقہ ایک اچھا ساتھی بھی ہے۔ یہ اس وقت تک نہیں بولتا جب تک میں اسے بولنے کو نہ کہوں۔"

سیف اللہ اعوان

چک نمبر ۱۳۱۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

اجنبی

وحید احمد تبسّم

جنید نے چلتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا..... اگلے ہی لمحے اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کی جیب کٹ چکی تھی جس میں پورے تین ہزار روپے تھے۔ اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اب ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اب واپسی کا کرایہ تک نہ تھا۔ وہ حیران اور پریشان سڑک کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنے گھر کیسے جائے گا۔ پریشانی کی حالت میں وہ کبھی ادھر ادھر دیکھتا اور کبھی خلا میں گھورنے لگتا۔ آس پاس اسے کوئی شخص نظر نہ آیا۔ البتہ کبھی کبھی جب کوئی کار اس کے پاس سے گزرتی ایک لمحے کے لئے اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔

جنید کو دفتری کام کے سلسلے میں دوسرے شہر آنا پڑا تھا۔ یہاں سے اس نے اڑھائی ہزار کا بل وصول کیا تھا پانچ سو اس کے اپنے تھے۔ وہ پریشانی کی حالت میں سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا وہ خود دار شخص تھا اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی سے مدد طلب کر سکے۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ معلوم نہیں، کوئی اس کی مدد بھی کرے گا یا نہیں۔ کیونکہ یہاں اس کا کوئی واقف بھی نہیں تھا اسے واپسی کے لئے کم از کم ساٹھ روپے کی ضرورت تھی۔

جنید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مایوسی اس پر بری طرح غالب تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا لمحہ بہ لمحہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے دور سے ایک سبز رنگ کی کار آتی نظر

آئی۔ ایک لمحے کو جنید نے سوچا کہ اس سے مدد طلب کی جائے مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اتنے میں وہ کار فراٹے بھرتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ رات کی سیاہ چادر شہر کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی اسے رہ رہ کر اپنی بیوی کا خیال ستا رہا تھا کیونکہ وہ وعدہ کر کے آیا تھا کہ شام سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے گا۔

گاڑیوں کی آمد و رفت اب پہلے سے کافی بڑھ چکی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ سفید رنگ کی ایک گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تھوڑا سا آگے جا کر رک گئی۔ جنید اس کے پاس پہنچا تو کھڑکی میں سے ایک شخص نے گردن نکال کر پوچھا۔ کہیں جانا ہے آپ کو؟

جنید ایک لمحہ حیران و پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مجبوری بیان کر دی۔ اجنبی بڑی توجہ سے اس کی بات سنتا رہا پھر اس نے کہا، "میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ اگر لاہور تک جا رہا ہوتا تو آپ کو ضرور ساتھ لے جاتا۔ بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ یہ رکھ لیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"نن..... نن..... نہیں..... مم..... میں یہ نہیں رکھ سکتا۔" جنید گھبرا گیا۔

"پلیز..... رکھ لیں۔ اس وقت آپ کو ان پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔" اجنبی نے سو کا نوٹ جنید کو زبردستی تھما دیا۔

جنید، جس کو شکریہ کے الفاظ بھی نہیں مل رہے تھے، اس نے روپے واپس کرنے کا وعدہ کرنا چاہا مگر وہ اجنبی مسکرایا اور اس نے کار چلا دی۔

جنید کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔ اس نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا اور اجنبی کو ہزاروں دعائیں دی۔

وقت گزرتا گیا۔ جنید اپنے محسن کو نہیں بھولا تھا اور اسکے دل میں حسرت ہی رہی کہ کس طرح اس کی ملاقات اپنے محسن سے ہو جائے تاکہ وہ اس کا قرض ادا کر دے۔

دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن وہ چند ضروری اشیاء خریدنے کی غرض سے ایک بہت بڑی دکان کے اندر کھڑا تھا۔

جوں ہی اس نے چیزیں خرید کر واپس جانا چاہا، اچانک اس کی نظر دکان سے باہر نکلتے ہوئے ایک

شخص پر پڑی۔

جنید تو لاکھوں میں اپنے محسن کو پہچان سکتا تھا۔ وہ شخص تیزی سے دکان سے باہر نکل رہا تھا۔ جنید بھاگتا ہوا اس طرف لپکا۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور کار آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ وہ زور سے چلایا..... "ٹھہریئے!"

اجنبی نے کار کی کھڑکی سے جھانک سے دیکھا اور پھر کچھ نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے! کیا کام ہے۔؟"

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں، آج سے دو سال پہلے آپ نے میری مدد کی تھی..... فیصل آباد میں..... یاد آیا آپ کو؟"

"اوہ!..... ہاں، یاد آیا" اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا اور بھرپور نظروں سے جنید کو دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ جنید اس کی طرف سو کا نوٹ بڑھا رہا ہے۔

"آپ کا یہ وہ احسان ہے جو آپ نے آج سے دو سال پہلے مجھ پر کیا تھا میں خود کو اس احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کر رہا ہوں..... یہ..... رکھ لیجئے۔"

اجنبی جو نہایت خوش اخلاقی سے ملا تھا، یک دم سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔ "میں نے یہ رقم واپس لینے کے لئے تو آپ کی مدد نہیں کی تھی اور یہ کوئی احسان نہیں تھا۔ یہ تو میرا انسانی فرض تھا۔"

"لیکن..... یہ رقم؟"

"ہاں! اس رقم سے اب تم کسی اور ضرورت مند کی مدد کرنا۔" اجنبی نے جنید کی بات کاٹ کر کہا۔ تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے اور لوگوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا احساس پیدا ہوتا رہے۔ میرے لئے تو یہ رقم کوئی اہمیت نہیں رکھتی، البتہ کسی ضرورت مند یا مصیبت زدہ انسان کے لئے یہ بڑی رقم ثابت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ سو کا نوٹ تمہاری مشکل کا حل ثابت ہوا تھا۔"

جنید اجنبی محسن کی باتیں سن کر گم صم ہو گیا۔ وہ گہری سوچوں میں گم نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ ان باتوں کی طرف تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا وہ واقعی شرمندہ ہو گیا۔

"خدا حافظ!" اجنبی نے کار آگے بڑھا دی۔

"خدا حافظ!" جنید آہستگی سے بڑبڑایا۔ اجنبی نے دوسری ملاقات میں اسے ایسی بات بتائی تھی جو روپے پیسے سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔

سوچئے تو!!

خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو

آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام آئے گا۔

منجانب

جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ

جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

F. 312 ۔ سائیٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ ۔ ۲۹۷۱۶۱ ۔ فیکس ۴۱۳۴۴۸

فریش ویل Freshwel **6028** Freshwel فریش ویل

Rs 20 — ۲۰ ویہ روپیہ — ૨૦ રૂપિયા — ۲۰ بیس روپے

Freshwel فریش ویل

روپے کی خصوصی بچت

فریش ویل مٹھائی، نمکین اور کھجلہ/پھینی کی ۵۰ روپے یا
اس سے زائد رقم کی خریداری پر ۱۰ فیصد کی خصوصی رعایت
یہ رعایت اس کوپن کے عوض فریش ویل کے کسی بھی
سیلز پوائنٹ سے مورخہ ۱۰/ رمضان المبارک تک
حاصل کی جا سکتی ہے۔

فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل

فریش ویل Freshwel **6029** Freshwel فریش ویل

Rs 20 — ۲۰ ویہ روپیہ — ૨૦ રૂપિયા — ۲۰ بیس روپے

Freshwel فریش ویل

۱۰ روپے کی خصوصی بچت

فریش ویل مٹھائی، نمکین اور کھجلہ/پھینی کی ۵۰ روپے یا
اس سے زائد رقم کی خریداری پر ۱۰ فیصد کی خصوصی رعایت
یہ رعایت اس کوپن کے عوض فریش ویل کے کسی بھی
سیلز پوائنٹ سے مورخہ ۱۰/ رمضان المبارک تک
حاصل کی جا سکتی ہے۔

فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل

فریش ویل Freshwel **6030** Freshwel فریش ویل

Rs 20 — ۲۰ ویہ روپیہ — ૨૦ રૂપિયા — ۲۰ بیس روپے

Freshwel فریش ویل

۱۰ روپے کی خصوصی بچت

فریش ویل مٹھائی، نمکین اور کھجلہ/پھینی کی ۵۰ روپے یا
اس سے زائد رقم کی خریداری پر ۱۰ فیصد کی خصوصی رعایت
یہ رعایت اس کوپن کے عوض فریش ویل کے کسی بھی
سیلز پوائنٹ سے مورخہ ۱۰/ رمضان المبارک تک
حاصل کی جا سکتی ہے۔

فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل Freshwel فریش ویل

فریشہ دیال سیلز پوائنٹس

۱۔ پریڈی اسٹریٹ صدر 524814
۲۔ جامع کلاتھ مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 214798
۳۔ بولٹن مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 229628
۴۔ لی مارکیٹ 731324
۵۔ پی آئی بی کالونی 411910
۶۔ یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا 685522
۷۔ لیاقت آباد ۔ ڈاک خانہ 417100
۸۔ پہلی چورنگی ۔ ناظم آباد 614941
۹۔ نرسری ۔ شاہراہِ فیصل 449855
۱۰۔ نشتر روڈ ۔ بالمقابل زولوجیکل گارڈن 710448

فریشہ دیال سیلز پوائنٹس

۱۔ پریڈی اسٹریٹ صدر 524814
۲۔ جامع کلاتھ مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 214798
۳۔ بولٹن مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 229628
۴۔ لی مارکیٹ 731324
۵۔ پی آئی بی کالونی 411910
۶۔ یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا 685522
۷۔ لیاقت آباد ۔ ڈاک خانہ 417100
۸۔ پہلی چورنگی ۔ ناظم آباد 614941
۹۔ نرسری ۔ شاہراہِ فیصل 449855
۱۰۔ نشتر روڈ ۔ بالمقابل زولوجیکل گارڈن 710448

فریشہ دیال سیلز پوائنٹس

۱۔ پریڈی اسٹریٹ صدر 524814
۲۔ جامع کلاتھ مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 214798
۳۔ بولٹن مارکیٹ ایم اے جناح روڈ 229628
۴۔ لی مارکیٹ 731324
۵۔ پی آئی بی کالونی 411910
۶۔ یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا 685522
۷۔ لیاقت آباد ۔ ڈاک خانہ 417100
۸۔ پہلی چورنگی ۔ ناظم آباد 614941
۹۔ نرسری ۔ شاہراہِ فیصل 449855
۱۰۔ نشتر روڈ ۔ بالمقابل زولوجیکل گارڈن 710448

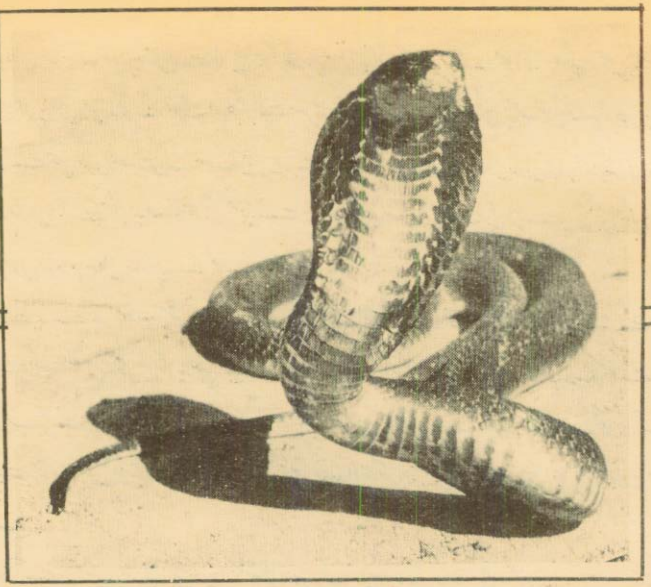

اگر سانپ ڈس لے

سید خورشید عالم

تھائی لینڈ کی ایک ۴۵ سالہ خاتون خن لیک ایک بار فیکٹری سے کام ختم کرکے آرہی تھی۔ راستے میں اُسے اپنے پاؤں کے نیچے لجلجی چیز کا احساس ہوا۔ فوراً بعد اُسے پاؤں میں شدید ٹیس اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا خوفناک سانپ سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو رہا ہے وہ سمجھ گئی کہ سانپ اُسے ڈسنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ خن لیک نے عجلت میں ہسپتال پہنچنے کے لئے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ہسپتال پہنچنے تک خن لیک کی پلکیں بھاری ہونے لگی تھیں اور اُسے اپنے سینے میں شدید کھنچاؤ کا احساس ہونے لگا تھا وہ ٹھیک طرح بول بھی نہیں پا رہی تھی اور اُسے ہر چیز دھندلی نظر آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر سمجھ گئے کہ اس خاتون کو کسی کوبرے نے ڈسا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً تریاق کا انتظام کیا۔ خن لیک کو چونکہ سانس لینے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس لئے فوری طور پر آکسیجن کا بندوبست بھی کیا گیا۔

دس دن بعد جب وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر واپس آئی تو ایک نئی تکلیف کا آغاز ہو گیا۔ جس پاؤں میں سانپ نے کاٹا تھا۔ اُس پاؤں میں زخم کے مقام کا گوشت سڑنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ خُن لیک کو ایک بار پھر ہسپتال جانا پڑا۔ جہاں اُسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چھ ہفتے لگے۔ اس کے بعد وہ اس قابل ہوئی کہ فیکٹری جا کر اپنا کام پھر سے شروع کر سکے خُن لیک تو خوش قسمتی سے بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے بچ گئی لیکن دنیا بھر میں سینکڑوں افراد ہر سال سانپ کے کاٹے سے مر جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیاء میں سانپوں کے ڈسنے کے واقعات دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیش آتے ہیں شاید آپ یقین نہ کریں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف ملائشیاء میں ہر سال سانپ کے کاٹنے کے چھ ہزار کیس رجسٹر کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح برما میں کل اموات کا دس فیصد سانپ کے کاٹے کا ہوتا ہے .. خوش قسمتی سے جنوب مشرقی ایشیاء کے کئی ممالک میں ۹۸ فیصد افراد کو بہتر طبی سہولتوں کی فراہمی کی بدولت بچا لیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیاء چار انتہائی خطرناک سانپوں کے خاندان کا مرکز ہے۔ زمین پر پائے جانے والے سانپوں میں سے ۴۹ اقسام کے سانپ اس خطے میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان میں دس اقسام انتہائی مہلک سانپوں پر مشتمل ہے۔ سانپوں سے کوئی ملک بھی محفوظ نہیں ہے۔ سانپ صحراؤں سے لے کر ذرخیز زمینوں اور کھیتوں اور گھنے جنگلات سے لے کر پہاڑی خطوں تک میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی کچھ اقسام انسانی آبادی کے نزدیک اپنا ٹھکانہ قائم کرتی ہے اور کچھ آبادی سے قدرے دور اپنا مسکن بناتے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے خطرناک سانپ کو برا کو سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ کوبرا انتہائی مہلک اور خطرناک سانپ ہوتا ہے۔ یہ گوشت خور ہوتا ہے اور مینڈک اس کی مرغوب غذا ہوتے ہیں "کنگ کوبرا" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی اٹھارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ سانپوں پر تحقیق کرنے والے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ کنگ کوبرا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ اپنی زندگی میں ۱۲۰ مرتبہ ڈنک مار کر اپنے شکار کو موت کی نیند سُلا سکتا ہے۔ اس کا شکار تھوڑی ہی دیر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کیوں کہ اس کی سانس رُک جاتی ہے جس کی وجہ سے دل اپنا کام کرنا بند کر دیتا ہے۔

قدیم زمانے سے انسان سانپ کے کاٹے کا علاج دریافت کرنے کی تگ و دو میں لگا ہُوا ہے۔ آج کل تریاق کے لئے جو سانپ کے کاٹے کا مکمل علاج سمجھا جاتا ہے۔ گھوڑے کے خون میں سانپ کے زہر کے کچھ حصے کو

انجیکٹ کر دیا جاتا ہے ۔ پھر چھ سے آٹھ ماہ بعد جب گھوڑے کے خون کے اجزا اُس زہر کے خلاف قوتِ مدافعت حاصل کر لیتے ہیں تب انہیں کشید کر لیا جاتا ہے ۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں تریاق تیار کرنے کا سب سے بڑا مرکز "کوئین ساؤوا ہا میموریل انسٹیٹیوٹ" بنکاک میں واقع ہے ۔ یہاں آج سے آدھی صدی سے بھی زیادہ عرصہ قبل ایک "اسنیک فارم" بنایا گیا ۔ چالیس آدمیوں پر مشتمل اسٹاف سات سو سانپوں اور دو سو گھوڑوں کی مدد سے چھ اقسام کے تریاق تیار کرنے کے کام پر مامور ہے ۔ صرف ۱۹۸۲ء میں اس ادارے نے امریکہ ، برطانیہ ، مغربی جرمنی ، سوئٹزرلینڈ ، پولینڈ فلپائن ، سنگاپور ، ہانگ کانگ اور ملائشیا کو تریاق کے ۱۳۸۷ یونٹ برآمد کئے ۔

سانپوں سے بچاؤ کے لئے جن احتیاطی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں ۔

- جنگلوں اور ویرانوں میں کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھاری لانگ بوٹ استعمال کریں ۔ اس طرح سانپ کے کاٹے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ سانپ عموماً پیروں ہی کو ڈستا ہے ۔
- زہریلے سانپ یوں تو کسی بھی وقت اپنے شکار پر حملہ آور ہو سکتے ہیں ۔ مگر موسم گرما کی راتوں میں وہ زیادہ فعال ہو جاتے ہیں ۔
- جنگل یا ویرانے میں سفر کرتے ہوئے ٹارچ روشن رکھیں اور ایک لاٹھی کو زمین پر زور زور سے مارتے ہوئے چلئے ۔
- جھاڑیوں یا بلوں میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش ہرگز نہ کیجئے ۔
- اسی طرح کسی بھی مُردہ یا زندہ سانپ کو اُٹھا کر بھی نہ چلئے ۔
- اپنے گھر کے باغیچے میں گھاس باقاعدگی سے کٹوا لیجئے اور بقیہ پودوں اور جھاڑیوں کی شاخوں کو بھی وقتاً فوقتاً کٹواتے رہئے ۔ اسی طرح ڈربوں اور کوڑا کرکٹ کی صفائی بھی باقاعدگی سے ضروری ہے ۔ اسی طرح گھر کو چوہوں سے محفوظ رکھئے ۔ کیونکہ یہ بھی سانپوں کی مرغوب غذا ہوتے ہیں ۔

سانپ عام طور پر اشتعال ہی کے عالم میں حملہ آور ہوتے ہیں ۔ اس لئے اگر کبھی آپ کا کسی سانپ سے اچانک سامنا ہو جائے تو گھبراہٹ کو پاس بھی پھٹکنے نہ دیں ۔ کوشش کریں کہ آپ ساکت رہیں اور اپنے حواس اپنے قابو میں رکھیں ۔ اسی طرح آپ اس نازک لمحے میں سانپ کے کاٹے سے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔ کوشش کیجئے کہ سانپ آہستگی کے ساتھ ایک ہی وار میں ڈھیر ہو جائے ۔ ورنہ زخمی سانپ عام زندہ سانپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔

عالمی ادارۂ صحت اور ہلالِ احمر نے سانپ کے کاٹنے کے بعد مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی سفارش کی ہے۔

۱۔ اگر کسی شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو اُسے ہر ممکن طریقے پر پُرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔ بہت سے لوگ سانپ کے کاٹنے کے بعد دہشت سے مرجاتے ہیں۔

۲۔ زخم کے مقام کو صاف کر دیجئے۔ اگر پانی مل جائے تو زخم کو دھو ڈالئے۔ تاکہ بقیہ زہر جسم میں سرایت نہ کر سکے۔

۳۔ اگر زخم ہاتھ یا پاؤں پر ہو تو لکڑی کی کھپچیوں کی مدد سے ہاتھ کو کس کر باندھ دیں۔ تاکہ زہر دورانِ خون میں شامل نہ ہو سکے۔

۴۔ اگر کسی شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو وہ دوڑنے بھاگنے کی کوشش نہ کرے بلکہ آہستگی سے چلتا رہے۔

۵۔ اگر کسی شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو کوشش کیجئے کہ اُسے کسی بھی طرح سونے نہ دیں بعض اوقات سانپ کا ڈسا ہُوا شخص زہر کے اثر کی وجہ سے نیند کا شدید غلبہ محسوس کرتا ہے۔ اس کا سوجانا ہی اس کے لئے موت ثابت ہوگا۔ کیونکہ ذہن اپنا کام کرنا بند کر دے گا۔

۶۔ پہلی فرصت میں مریض کو قریب ترین ہسپتال میں پہنچانے کی کوشش کیجئے۔

بجلی کا ڈسا مانگے نہ پانی

بجلی کے ننگے تار اور پلگ وغیرہ

سانپ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں۔ بجلی کے تاروں اور سوئچ بورڈ وغیرہ کو کھلونا نہ جانیئے۔ ان سب سے دُور رہیئے۔ بجلی کے سامان کو احتیاط سے استعمال کیجئے۔

سنا خیری

مظلوم

نعیم کا باپ مجید ایک فیکٹری میں مزدور تھا۔ ایک روز وہ فیکٹری میں ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ گھر کا سارا خرچہ مجید ہی چلاتا تھا۔ اس کی بیوی فیکٹری کے مالکوں کے پاس مالی امداد کے لئے گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر غلطی اس کی تھی اور اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں زیادہ معاوضہ دینے سے انکار کر دیا اور ایک حقیر سی رقم پیش کی جو کچھ ہی دنوں میں ختم ہو گئی۔

گھر میں پانچ نفوس تھے۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ نعیم کی ماں ان پڑھ اور کاہل عورت تھی۔ گھر کے سو خرچے تھے۔ کھانے پینے کے علاوہ دوا دارو، بچوں کی کتابیں، کاپیاں، آنے جانے کا کرایہ وغیرہ۔ اسکول کی فیس البتہ معاف تھی۔ صرف نعیم اور حمید ہی اسکول جاتے تھے۔ شازیہ اور عابد ابھی چھوٹے تھے۔ مجید جب زندہ تھا تو یہ خرچے بڑی مشکل سے پورے کرتا تھا۔ ساری تنخواہ بمشکل مہینہ بھر چلتی۔ کبھی کبھی تو مہینے کے آخری دنوں میں سارے پیسے ختم ہو جاتے اور اس طرح بڑی مشکل درپیش ہوتی۔ لیکن مجید بڑا جوانمرد تھا، حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا۔ خودداری تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چاہے پیسے سب ختم ہو گئے ہوں، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو اور مدد مانگنے کو وہ بہت برا سمجھتا تھا۔

ایسے وقت میں وہ صبح سویرے اٹھ کر سبزی منڈی جا کر سامان کے ٹوکرے اٹھاتا یا پھر شام کو فیکٹری سے لوٹنے کے بعد یہ کام کرتا اور چند روز کا خرچہ نکال لیتا۔ اگر کبھی کوئی کام نہ ملتا تو پھر مجبوراً اگلے

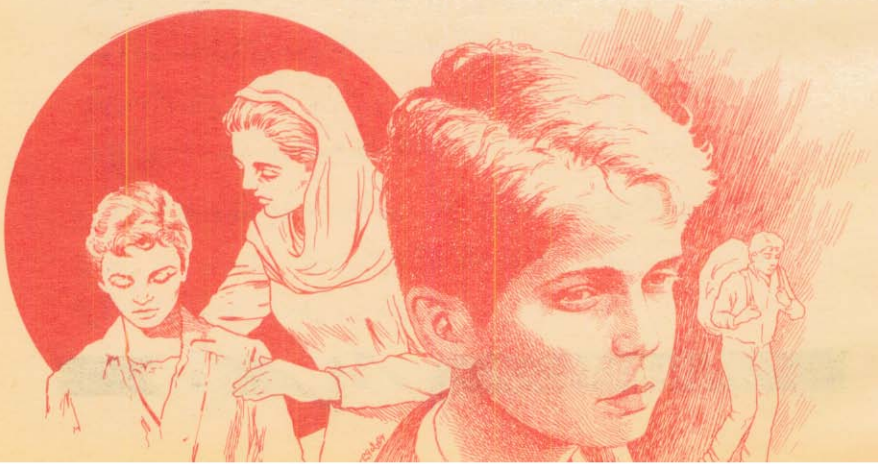

مہینے کی تنخواہ سے کچھ پیسے مانگ لیتا۔ وہ ہر حال میں راضی خوشی رہنے والا اور اللہ کا شکر ادا کرنے والا بندہ تھا۔ اس کی بیوی البتہ بالکل مختلف مزاج کی عورت تھی۔ ہمیشہ وہ گھر کے خرچوں کا رونا ہی روتی رہتی اور کبھی خوش نہ ہوتی۔ اپنے خاوند سے اسے ہمیشہ گلہ رہتا اور شکوہ شکایت ہی کرتی رہتی۔ اب جو ایسے میں وہ سائبان جس کی ٹھنڈی چھاؤں تلے وہ رہ رہے تھے ان کے سر سے سرک گیا تو وہ تپتی ہوئی دھوپ کے نیچے آ گئے۔ نعیم کی ماں کو اب محسوس ہوا کہ کیا قیامت ان پہ ٹوٹ پڑی ہے، اس بھری پری دنیا میں وہ یکایک خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگی۔ سب کو مجید کی اس ناگہانی موت کا بڑا افسوس تھا۔ نعیم کے چچاؤں، پھوپھیوں، خالاؤں، ماموؤں نے بڑی دلجوئی کی۔ ان کے دُکھ کو محسوس کیا، ان کی ضرورتوں کا خیال کر کے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مالی مدد کی۔

نعیم کی ماں پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ شوہر کے علاوہ گھر کے خرچہ کی فکر اسے مارے ڈال رہی تھی۔ ایسے میں رشتہ داروں کے حسن سلوک اور مالی امداد نے اسے بڑا سہارا دیا۔ لیکن ایک دن وہ تمام رقم ختم ہو گئی۔ نعیم کے تایا کے مالی حالات دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً اچھے تھے۔ پیسے ختم ہوئے تو نعیم کی ماں کو ان کا خیال آیا۔ وہ سیدھی ان کے یہاں پہنچی اپنا مطلب بیان کیا کہ تھوڑا بہت جو رشتہ داروں نے اس غم کے موقع پہ دیا تھا سب خرچ ہو چکا ہے اور اب پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ نعیم کے تایا نیک دل انسان تھے۔ انہیں اپنے بھائی اور اس کی اولاد سے بڑی محبت تھی۔ وہ یہ سن کر تڑپ اٹھے۔ "نہ نہ..... تم رو مت..... فکر کیوں کرتی ہو..... ابھی میں زندہ ہوں تمہارا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ پانچ سو روپے رکھ لو..... آئندہ مہینے سے میں تمہیں چار سو روپے دیتا رہوں گا" نعیم کی ماں کی جان میں جان آئی..... کچھ آسرا بندھا تھا۔ اب ہر مہینے چار سو روپے کی لگی بندھی رقم گھر آنے لگی..... مگر بھلا چار سو روپے میں کہاں گزارہ ہوتا ہے۔ نعیم کا باپ بھی ہزار بارہ سو تو کماتا ہی تھا۔ ایک دن جب نعیم کے ماموں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "کیا بتاؤں سو خرچے ہیں اور کوئی آمدنی نہیں۔ فضل بھائی (نعیم کے تایا) ہر مہینہ چار سو روپے دیتے ہیں پر وہ پورا کہاں پڑتا ہے۔ دو وقت کا کھانا، نعیم اور حمید کی آئے دن کتابیں، کاپیاں، پینسلیں آتی رہتی ہیں، کبھی کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو دوا دارو الگ..... کبھی کسی کی چپل ٹوٹ گئی، کبھی کپڑے پھٹ گئے..... کیا کروں....." وہ زور زور سے رونے لگی۔ "وہ تو بھائی اور بچوں کا خیال کر کے دے دیتے ہیں پر تم بھی تو دیکھو میں کیا کروں۔ کہاں تک اتنے کم پیسوں میں خرچہ چلاؤں" "اچھا" اس کے بھائی نے

ٹھنڈی سانس بھری اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے "اس وقت تو میرے پاس یہی کچھ ہے۔ آئندہ جو بھی مجھ سے ہوتا رہے گا کروں گا۔ تم جانتی ہو میرے حالات بھی اتنے کون سے اچھے ہیں۔" ایک روز ایک دم سے مکان خالی کرنے کا نوٹس آگیا۔ یہ مکان فیکٹری نے رہنے کے لئے دیا تھا۔ نعیم کی ماں حواس باختہ ہوگئی۔ گھبرا کر بھائیوں کے یہاں دوڑی تو چھوٹے نے ساتھ رہنے کے لئے کہہ دیا۔ جانا تو کوئی بھی نہ چاہتا تھا لیکن مجبوری آن پڑی تھی۔ گو اس مکان کے چپے چپے سے بہت خوبصورت یادیں وابستہ تھیں۔ نعیم کے باپ کی خوشبو بسی تھی۔ آخر کار وہ لوگ چھوٹے ماموں کے یہاں آگئے۔ تین کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جس کا ایک کمرہ انہیں دے دیا گیا۔ گھر میں ماموں کے علاوہ ممانی اور دو بچے تھے۔ ماموں ممانی نے انہیں نئے گھر میں خوش آمدید کہا۔ ان پانچوں کے کھانے پینے کا خرچ بھی چھوٹے ماموں اٹھانے لگے۔ شروع شروع میں کچھ دن تو ممانی نے بڑی آؤ بھگت کی مگر پھر وقت کے گزرتے پہیہ کے ساتھ ان کا رویہ بھی بدلتا گیا۔ گو ان کا سلوک اتنا بُرا تو نہ تھا لیکن کبھی کبھی کوئی طعنہ دے دیتیں۔ طنز کا تیر اچھال دیتیں۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تو تڑاخ اور لڑائی جھگڑا ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ آخر ہر انسان کے مزاج اور طبیعت میں فرق ہوتا ہے۔ نعیم کی ماں کاہل، سست اور ناشکری سہی مگر وہ جھگڑالو نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بات کبھی ایک آدھ جملے سے زیادہ آگے بڑھی نہیں۔ نعیم اور بہن بھائیوں سے بڑا تھا اور حسّاس بھی۔ اسے اپنے باپ سے بہت محبت تھی اور اس کے جانے کے بعد وہ اور حسّاس ہوگیا تھا۔ وہ بڑا سمجھ دار بچہ تھا۔ سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے رشتہ دار ان کی مالی امداد کر رہے ہیں اور اس کی ماں جب بھی کبھی ضرورت پڑتی کسی نہ کسی بہن، بھائی، دیور، نند، کے گھر جاکر حرف مدعا بیان کرتی اسے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ بالکل اپنے باپ پر گیا تھا اور اسے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ان سے مدد مانگنے سے بڑی نفرت تھی۔ بے شک اللہ اور اس کے رسولؐ نے مستحق رشتہ داروں کا خیال رکھنے کو کہا ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور عمر بھر دوسروں پہ بوجھ بنے رہیں۔

پچھلے دنوں عابد بیمار پڑا تو اس کی بیماری پہ کافی پیسے خرچ ہوگئے اوپر سے سردیاں سر پہ آگئیں۔ نعیم کا اسکول کا سوئٹر چھوٹا ہوگیا تو وہ حمید کو مل گیا مگر اب نعیم کے پاس کوئی سوئٹر نہ تھا۔ نعیم کی ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ نیا سوئٹر بناتی یا خریدتی۔ بچّوں کو لے کر ایک دن اپنے دیور کے گھر پہنچی اور موقع دیکھ کر دیور سے مخاطب ہوئی "بھائی میں بڑی ضرورت کے تحت آئی ہوں کچھ روپوں کی سخت

ضرورت ہے" "بھابھی آج کل تو خود کڑکی چل رہی ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ جیسے ہی کچھ ملا تمہیں دے دوں گا" نعیم یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اسے اپنی ماں کا اس طرح روپے مانگنا بہت برا لگا مگر چپ بیٹھا رہا۔ وہاں سے مایوس ہوئی تو وہ لوگ خالہ کے یہاں پہنچے۔ نعیم کی خالہ نے سو روپے دے کر کہا "اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتی" نعیم کو مارے شرم کے پسینہ آنے لگا مگر اس کی ماں مسکرانے لگی۔ "بیٹے..... بس تجھے چند دن کی تکلیف ہوگی" گھر آکر ماں نے نعیم سے کہا۔ "پھر جب مجھے اور پیسے ملیں گے تو تیرا سوئٹر بنادوں گی ویسے بھی ابھی اتنی سردی تو نہیں پڑی نا"۔

اگلے روز حمید اکیلا گھر آیا تو ماں نے پوچھا "نعیم کہاں ہے؟" "ماں وہ تو وہیں اسکول میں ہی رک گیا۔ مجھے بھیج دیا۔ کہتا تھا میں روز ماسٹر جی سے چھٹی کے بعد پڑھا کروں گا۔ دیر سے آؤں گا"۔ چار دن اسی طرح گزر گئے۔ نعیم روز شام کو گھر آتا۔ پانچویں روز نعیم کی ماں کو ضروری کام سے بازار جانا تھا۔ خریداری کرتے کرتے اس کی نگاہ ایک طرف اٹھی تو اٹھی رہ گئی..... نعیم نے سر پر بھاری ٹوکرا رکھا ہوا تھا جسے وہ اٹھا کر سوزوکی تک گیا اور اس میں وہ ٹوکرا رکھ دیا۔ پھر وہ جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلنے لگا۔ نعیم کی ماں بت بنی کھڑی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد دوبارہ ٹوکرے کو سنبھالے نعیم آتا دکھائی دیا۔ پہلے کی طرح یہ ٹوکرا بھی اس نے سوزوکی میں رکھ دیا۔ پھر اس طرح اس نے تیسرا چکر کیا اور پھر چوتھا۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو گیا تھا اور قمیص پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ نعیم کی ماں ایک ٹک خلا میں دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ سوچ جا رہی تھی۔ اس کے اس چہرے پہ اس مختصر سے عرصے میں کئی رنگ نظر آئے۔ آخر دوکاندار کے پکارنے پہ وہ چونکی اور جلدی جلدی خریداری کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

نعیم گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کے پاس پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس پہ نوٹ ہی نوٹ رکھے دکھائی دینے لگے۔ خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ وہ بولا "ماں اب تمہیں دوسروں سے کچھ مانگنا نہیں پڑے گا۔ دیکھو یہ سو روپے ہیں اور میں نے کمائے ہیں۔ ہاں..... سچی میں نے کمائے ہیں صرف پانچ دنوں میں..... ماں میں ماسٹر صاحب سے پڑھنے تھوڑا ہی جاتا تھا..... میں تو سامان اٹھا کر یہ پیسے جمع کئے ہیں۔" اس نے اپنی بانہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔ "ماں مجھے بہت برا لگتا ہے جب تم کسی سے پیسے مانگتی ہو۔ ماں، بابا کو بھی تو یہ بات پسند نہیں ہے۔ بس اب تم فکر مت کرنا..... میں روز سامان اٹھایا کروں گا اور پیسے لایا کروں گا۔ اب تمہیں کسی سے کچھ مانگنا نہیں پڑے گا۔" "ہاں میرے بچے" ماں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور پیار کرتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے بولی "اب میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

نیا سورج

سلمان غزالی

"یار اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اسلم کی حرکتیں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ کل پھر اس نے ایک لڑکے کو بلاوجہ پیٹ دیا۔ دل چاہتا ہے کہ اسے ایسی سزا دوں کہ وہ ساری عمر یاد رکھے اور آئندہ تمام غنڈہ گردی بھول جائے۔" بلال کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ جنید نے کاپی پر سے نظریں اٹھائیں اور بلال کو دیکھنے لگا۔ "مگر تم یہاں بیٹھے کیوں غصہ کھا رہے ہو جب اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ پورے کالج میں کسی کی ہمت ہے کہ اس کا سامنا کر سکے۔ اس کا اثر و رسوخ اتنا ہے کہ ایک آدھ لڑکے کے کہنے پر تو اساتذہ اور پرنسپل بھی اس کے خلاف ایکشن نہیں لیتے اور سب لڑکوں میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ مل کر اس کے خلاف گواہی دیں۔ رہی ثبوت کی بات تو وہ تم مہیا نہیں کر سکتے اور پھر ایسی باتیں سوچنے سے فائدہ۔ چپ چاپ اپنا کام کرو۔" جنید نے ناگواری سے جواب دیا جیسے اسے بلال کی باتیں اچھی نہ لگی ہوں۔ بلال کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر جنید کا لیکچر سن کر خاموش ہو گیا اور اپنے نوٹس اتارنے لگا۔

ابھی انہوں نے بمشکل چند سطریں ہی اتاری ہوں گی کہ پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے ناصر کھڑا تھا۔ وہ بہت بوکھلایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے ناصر تم بہت پریشان لگ رہے ہو، خیر تو ہے۔" ناصر کو دیکھ کر بلال بولا۔

"یار ابھی تک تو خیریت ہے مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ناصر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈر..... کیسا ڈر، ذرا کھل کر بتاؤ" جنید بولا۔

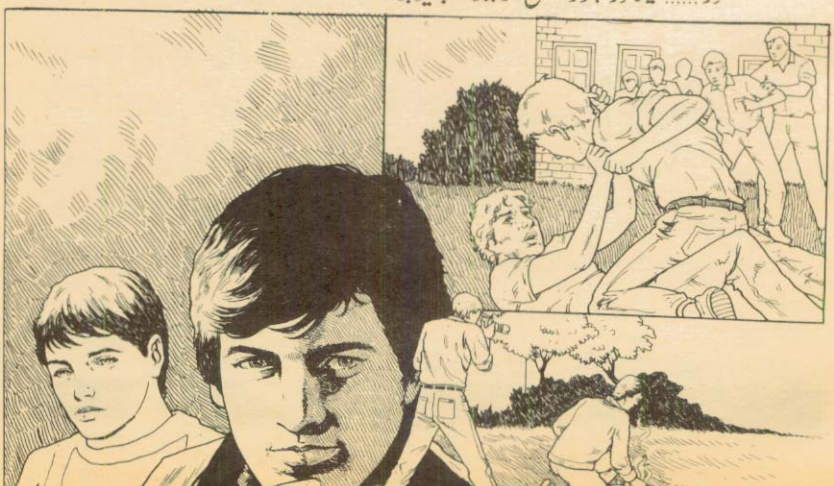

"وہ بات دراصل یوں ہے کہ فوٹو گرافی کا ایک مقابلہ ہو رہا ہے اور تمہیں تو معلوم ہے کہ مجھے فوٹو گرافی کا کتنا شوق ہے۔ اس سلسلے میں، میں کسی اچھے منظر کی تلاش میں سپر ہائی وے کی طرف نکل گیا۔ تم جانتے ہو کہ وہاں اسلم کی زمینیں اور باغات ہیں۔ اس وقت یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی چنانچہ میں گھومتا ہوا باغ میں چلا گیا۔ ابھی میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک درخت کے پیچھے پڑی اور وہاں میں نے دیکھا کہ اسلم اور شاہد کھڑے تھے۔ اسلم کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور وہ انہیں آگ دکھا رہا تھا جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ امتحانی پرچے تھے۔"

"امتحانی پرچے" بلال کے منہ سے بے ساختہ نکلا "دیکھا مجھے پورا یقین تھا کہ پرنسپل کے آفس سے پرچے اسلم ہی چرا سکتا ہے اور میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا مگر تم نے میری بات سنی ہی نہیں۔" بلال جنید سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے اور سب ہی جانتے ہیں مگر ہمارے جاننے سے ہوتا کیا ہے۔ ناصر تم بتاؤ پھر کیا ہوا۔" جنید ناصر کی طرف مڑتا ہوا بولا۔

پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کیمرے سے ان دونوں کی تصویر کھینچ لی .....

"کیا!" بلال اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کہاں ہے وہ تصویر"

"تصویر ڈیولپ نہیں کروائی مگر کیمرے کی ریل میرے پاس ہے" ناصر نے جواب دیا۔

"رک جاؤ بلال، وہ بھی دیکھ لیں گے پہلے ناصر اپنی بات مکمل کر لے" جنید نے بلال کو روک دیا "ناصر تم اپنی بات پوری کرو۔"

"جب میں نے تصویر کھینچی تو شام کا وقت تھا۔ فلش لائٹ کی چمک سے دونوں چونک گئے۔ ان کے چونکنے سے میں بھی ہوش میں آگیا اور وہاں سے بھاگا وہ دونوں میرے پیچھے بھاگے۔ میں بھاگ کر مین روڈ پر آگیا جہاں میری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور فل اسپیڈ سے چلاتا ہوا گھر آگیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان دونوں کے پاس اس وقت ٹرانسپورٹ نہ تھی اور وہ میرا پیچھا نہ کر سکے۔ اس وقت تو میں بچ گیا مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں خطرے میں ہوں نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے انہوں نے مجھے پہچان لیا ہو حالانکہ میں ان سے کافی فاصلے پر تھا اور وہ ایک دفعہ بھی میرے قریب نہ آسکے مگر میں اپنے دل سے اسلم کا خوف نہیں نکال سکا۔ ایک انجانا سا خطرہ مجھے ڈرائے جا رہا ہے۔ اسلم اور اس کے ساتھی تو بات بات پر جھگڑتے ہیں خون نکال

دیتے ہیں اور بلال تم تو جانتے ہو میرا مرض۔ مجھے "ہیموفیلیا" ہے جس میں اگر جسم میں ایک دفعہ خون نکلنا شروع ہو جائے تو پھر آسانی سے نہیں رکتا اور بہے جاتا ہے اور اگر مریض کو جلد اسپتال نہ پہنچایا جائے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اُف خدایا میں کیا کروں جنید مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے گھر والے مجھے پہلے ہی روکتے تھے اس فوٹو گرافی کے شوق میں زیادہ دور جانے سے" ناصر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

"تم فکر نہ کرو ناصر کچھ نہ ہو گا ہم کام ختم کر لیں پھر تم ہمارے ساتھ ہی گھر چلنا" بلال نے اسے تسلی دی "اور ہاں وہ کیمرہ کہاں ہے"

"ارے ہاں! میں تو بھول ہی گیا میں اپنا کیمرے والا بیگ ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ریل کیمرے کے اندر ہی ہے۔ میں یہ تمہیں دینے کے لئے ہی لایا تھا اس کو اپنے پاس رکھ کر مجھے خوف محسوس ہوتا ہے" یہ کہہ کر ناصر نے پہلے کلاس کا دروازہ بند کر دیا اور پھر بیگ میں سے کیمرہ نکال کر دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی فالتو ریل ہے" بلال نے کیمرہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیگ میں ہو گی تو ضرور مگر اس کی کیا ضرورت ہے"

"تم سے چھوڑو اور لاؤ یہ بیگ مجھے دو" یہ کہتے ہوئے بلال نے ناصر سے بیگ لے لیا۔ بلال نے کیمرے میں سے ریل نکالی اور اسے حفاظت سے اس کی ڈبیا میں رکھا اور بیگ میں سے دوسری ریل نکال کر کیمرے میں ڈال دیا اور کیمرے کو بیگ میں رکھا اور اصل ریل کو حفاظت سے اپنی شرٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے بیگ کو میز پر رکھا اور ناصر سے بولا

"تم ذرا ٹھہرو ہم اپنا کام ختم کر لیں پھر سب چلتے ہیں" یہ کہنے کے بعد بلال جلدی جلدی بورڈ سے کام اتارنے لگا۔ جنید نے بھی کام شروع کر دیا۔ ناصر ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اچانک وہ کھڑا ہو گیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو "ارے میں تو بھول ہی گیا۔ ابو گھر پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے میں پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔ تم دونوں کام ختم کر کے میرے پیچھے آ جاؤ میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر ناصر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ دونوں نے اپنے کام کرنے کی رفتار اور تیز کر دی ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ بلال کی نظر میز پر پڑی وہاں بیگ نہ تھا۔ "ارے یہ بیگ کہاں گیا" بلال کے منہ سے ایک دم نکلا جنید نے بھی چونک کر دیکھا "کہیں ناصر بھول کر اپنے ساتھ نہ لے گیا ہو" دونوں نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں بیگ نہ تھا دونوں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا "اگر ناصر کو بیگ کے ساتھ اسلم نے دیکھ لیا تو..... جنید اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ دونوں نے اپنا سامان اٹھایا اور بھاگتے

ہوئے کلاسوں سے باہر نکلے وہ اس وقت تیسری منزل پر تھے سیڑھیاں کلاس کے ساتھ ہی تھیں اور گراؤنڈ فلور پر راہداری میں جا کر ختم ہوتی تھیں۔ راہدی کے دائیں طرف ہی کالج کا مین ہال تھا جس سے نکلنے کے بعد میدان اور باغ آتا تھا جس سے گزر کر مین گیٹ آتا تھا چنانچہ دونوں سیدھے باغ میں پہنچے۔ کالج تقریباً خالی ہو چکا تھا اور آس پاس کوئی لڑکا نظر نہیں آ رہا تھا دونوں نے جیسے ہی باغ میں قدم رکھا ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئے۔ جس بات کا ڈر ابھی تک بلال اور جنید کے دل میں تھا اور جس خوف کا اظہار ناصر اپنی زبان سے کر چکا تھا وہی بات ہو گئی تھی۔ ناصر کا کیمرہ کئی ٹکڑوں کی صورت میں گھاس پر پڑا تھا۔ ایک طرف ریل چر مر ہوئی پڑی تھی اور ناصر زخمی حالت میں گھاس پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں لپک کر اس کے پاس پہنچے بلال نے آگے بڑھ کر سہارا دیا ناصر کے جسم پر کئی جگہ نیل نظر آ رہے تھے مگر خون صرف بازو سے نکل رہا تھا چوٹ زیادہ گہری نہیں تھی اور خون بھی آہستہ آہستہ نکل رہا تھا مگر مسلسل بہے جا رہا تھا اور یہ ناصر کی اپنی قسمت تھی کہ خون بہتا تو پھر بہے چلے جاتا۔ گو اس سے کوئی خاص فرق تو نہ پڑتا تھا مگر بلال نے زخم پر پھر بھی رومال باندھ دیا اور ناصر کو سہارا دے کر کالج سے باہر لے آیا۔ جنید پہلے ہی ٹیکسی رکوا چکا تھا تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی چل پڑی۔ جنید کے کہنے پر ٹیکسی ڈرائیور نے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں انہیں اسپتال پہنچا دیا۔ ناصر کو ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرنے کے بعد دونوں ویٹنگ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ پندرہ منٹ بعد نرس نے بتایا کہ خون بہنا بند ہو گیا اور اب مریض خطرے سے باہر ہے۔ چنانچہ دونوں فوراً اٹھ کر ناصر کے پاس گئے مگر وہ انجکشن لینے کے بعد سو چکا تھا۔ بلال اور جنید نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور باہر نکل آئے۔ جنید نے پہلے ٹیلیفون کے ذریعے ناصر کے گھر والوں کو اطلاع دی اور پھر دونوں بلال کے گھر آ گئے کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہی جنید بولا۔ "اب اس دفعہ اسلم کو ضرور سزا ملنی چاہئے۔ وہ اصلی فلم تو ہے نا تمہارے پاس"

"ہاں فلم میرے پاس محفوظ ہے آج ہی ہم اسے ڈیولپ کروالیں گے اور کل اسے پرنسپل کے سامنے پیش کر دیں گے۔ امتحانی پرچے چوری کرنا کوئی معمولی جرم نہیں اب اسلم کو ضرور سزا ملے گی اور نہ صرف سزا ملے گی بلکہ وہ کالج سے بھی نکلے گا اور ذلیل و خوار ہو گا۔"

"یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں بلال۔ ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس ثبوت ہے مگر اسلم کے ہاتھ بھی لمبے ہیں وہ کوئی سخت کارروائی نہیں ہونے دے گا۔ طلبہ کے شور پر کچھ ایکشن تو ہو گا مگر جو تم سوچ رہے ہو وہ بہت مشکل ہے"

"اس مشکل کو میں آسان بناؤں گا۔ میں خاموشی سے یہ ثبوت پرنسپل کے حوالے نہیں کر دوں گا۔ اس سے پہلے میں اسلم کو خود سزا دوں گا" بلال جوش کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم" جنید بلال کی بات سے حیران ہو گیا۔

"ہاں جنید اب ہم وہ نہیں رہیں گے جس کا وجود ایک سوکھی لکڑی کی طرح اسلم جیسے لوگوں کی زور سے چٹختا رہے، ان کی باتوں سے سلگتا رہے۔ اب میں اسکو سبق سکھاؤں گا اور ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ اس کے ساتھی اپنی تمام غنڈہ گری ہمیشہ کے لئے بھول جائیں گے"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو بلال آخر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ ممکن ہے کیونکہ کالج کا ہر لڑکا اسلم کے خلاف دل میں نفرت لئے بیٹھا ہے مگر پہل کرنے سے ڈرتا ہے اور یہ پہل ہم کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ پورا کالج ہمارا ساتھ دے گا۔ تم ہی بتاؤ کہ آج تمام شریف لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غنڈہ گردی عام ہو گئی ہے اگر شرافت گھروں میں چھپ کر بیٹھ جائے گی تو پھر گلیوں میں بازاروں میں، کالجوں میں آوارگی کے سوا کیا نظر آئے گا ہمیں مل کر ان سب کے خلاف قدم اٹھانا اور نہ صرف اسلم کا زور توڑنا ہے بلکہ ایسے تمام اسلموں کو بتا دینا ہے کہ حق یکجا ہو جائے تو اس کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔ جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔" یہ کہہ کر بلال نے اپنا ہاتھ جنید کی طرف بڑھایا۔

جنید جو سر جھکائے بلال کی باتیں سن رہا تھا اس نے سر اٹھا کر بلال کی طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر اسے گلے لگا لیا جو کہ اس کے تعاون کے یقین کا بہترین طریقہ تھا۔

دوسرے دن بلال اور جنید کالج وقت سے پہلے پہنچ گئے اور راہداری میں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں اسلم کالج میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ میدان سے گزر کر انہیں کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی ان کے پاس پہنچا بلال ایک دم اس کے آگے آ گیا۔ اسلم کے راستے میں کبھی کوئی نہیں آیا تھا اس لئے وہ اسی زعم میں سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بلال کے ساتھ ٹکرا گیا اسلم نے غصے کے ساتھ بلال کا گریبان پکڑا اور بولا "تمہیں نظر نہیں آتا کیا"

"اگر مجھے نظر نہیں آتا تو تم ہٹ جاتے راستے سے" بلال نے نہایت اعتماد کے ساتھ اسلم کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اسلم کو ایسے جواب کی امید نہ تھی وہ ایکدم بپھر گیا اور بلال کو ایک ہاتھ رسید کرنا

چاہا مگر بلال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسلم نے اس دفعہ بلال کو زور سے دھکا دیا اور بلال پیچھے کی طرف گرتا چلا گیا۔ اسلم نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا مگر اس دفعہ جنید نے آگے بڑھ کر اسلم کے ایک زوردار دو ہتڑ مارا اسلم لڑکھڑا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا بلال کے ایک ہاتھ سے وہ نیچے گر گیا اور لڑکھتا ہوا میدان میں آگیا۔ بلال اور جنید کو دیکھ کر ان کے قریبی دوست فرحان اور جمشید بھی بڑھے اور چاروں نے مل کر اسے جالیا اور اٹھنے کا موقع نہیں دیا اسلم کو پٹتے دیکھ کر اس کے چاروں ساتھی اس کی مدد کے لئے بڑھے مگر انہیں راستے میں ہی رکنا پڑا۔ وہ تمام لوگ جواب تک خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے اب ان کے دل سے اسلم کا خوف نکل چکا تھا وہ آگے بڑھے کر ایک دیوار کی مانند ان کے راستے میں آگئے ایک لمحے کو اسلم کے چاروں ساتھی رکے پھر تمام لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر میں پرنسپل بھی وہاں پہنچ گیا۔ پرنسپل کو دیکھ کر بلال، جنید، فرحان اور جمشید اسلم کو چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ پرنسپل نے اسلم کو حیرت سے زمین پر پڑے ہوئے دیکھا اور بولے۔ "کیا ہوا اسے کس نے مارا ہے اسے"

"ہم نے مارا ہے اسے" تمام لڑکے ایک آواز ہو کر بولے۔ مجمع کے اس ردعمل پر پرنسپل چونک اٹھے۔ انہیں اب احساس ہوا تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ وہ ابھی حیرت سے اسلم اور تمام لڑکوں کو دیکھ رہے تھے کہ بلال نے آگے بڑھ کر اسلم کی تصویر پرنسپل کے ہاتھ میں تھمادی اور ان سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تمام معاملہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا مجرم بھی آپ کے سامنے ہے اور ثبوت آپکے ہاتھ میں۔ اس تصویر کی ایک کاپی میں پولیس تک پہنچا چکا ہوں اور اب تک وہ آنے والی ہوگی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے کالج کا کوئی لڑکا کبھی جیل نہیں گیا اس لئے پولیس کے آنے سے پہلے اگر اسلم کا نام کالج کے رجسٹر سے خارج ہو جائے تو ہمارے کالج کا ریکارڈ ہمیشہ کے لئے صاف ہو جائے گا۔" پرنسپل نے بلال کی طرف گہری نظروں سے دیکھا اب ان کی چہرے پر حیرت کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی تھی۔ وہ آہستگی سے مڑے اور اپنے آفس کی طرف بڑھنے لگے۔ اسلم اب تک زمین پر چت لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر اتنی چوٹیں نہ تھیں کہ وہ اٹھ نہ سکتا مگر شکست کا بوجھ اسے اٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ اس کا غرور مٹی میں مل چکا تھا۔ بلال نے ایک نظر اسلم پر ڈالی اور پھر تمام لڑکوں کو ایک ساتھ کھڑے دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے حق کی ننھی ننھی کرنوں نے مل کر ایک سورج کی شکل اختیار کر لی ہو جس کی روشنی سے ظلمت کے بادل چھٹ رہے ہوں۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ یہ اس کی نہیں حق کی جیت تھی۔

ضربِ مومن

طاہر مسعود

حملہ کا انتظار

جیپ سے اڑنے والی دھول میں شام مٹیالی ہوئی پھر ڈوب گئی۔ اندھیرے بڑھنے لگا۔ بریگیڈیئر امجد شعیب کی گاڑی آکر رکی۔ معلوم ہوا کہ حملے کی تیاریاں مکمل ہیں اور جلدی میں روانگی عمل میں آنے والی ہے۔

"آپ کی جیپ سب سے پیچھے ہوگی۔ اور ہاں اپنا PASSWORD یاد کر لیجئے۔ "آدمی اور بلب" جب کوئی آپ کو روکے گا تو وہ کہے گا۔ آدمی" آپ جواب میں کہئے گا "بلب" اگر آپ یہ الفاظ بھول گئے تو آپ آگے نہیں جاسکیں گے" ۔ ہماری جیپ چلی تو پیچھے بندھا ٹرالر بھی چلا لیکن ایک فرلانگ بھی آگے نہ جانے پائے تھے کہ جیپ کے پہیے ریت میں دھنس گئے۔ ڈرائیور بھاگ کر فوجی جوانوں کو بلا لایا جو کہیں قریب ہی کوچ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جوانوں نے نعرہ لگا کر جیپ کو دھکا دیا تو پہیے

ریت سے تو نکل آئے لیکن تھوڑی دور جاکر پھر ریت نے جیپ کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ ساری گڑ بڑ ٹرالر کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ میجر شیرازی نے پہلے ہی کہا تھا کہ ٹرالر کو یہیں چھوڑ دیا جائے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پورا یونٹ یہاں سے کہیں آگے منتقل ہو رہا تھا اس لئے ٹرالر تو جیپ کے ساتھ ہی رہا۔ ہم لوگ بھی ٹرالر کو ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے کیونکہ جنگی صورتحال تھی، ہم پہلے ہی اپنے ساتھیوں سے بچھڑے ہوئے تھے سامان سے بچھڑ جاتے تو کہیں کے نہ رہتے۔ غالباً گھنٹے بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد جیپ مڑ کر ایک نہر کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ پھر ایک آموں کا باغ آیا جہاں ساری فوجی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ میجر شیرازی کی ہدایت پر ہمیں رات کا ڈنر ایک پیکٹ میں بند کر کے دے دیا گیا تھا۔ اب جو یہاں جیپ رکی تو سوچا کہ اس گھور اندھیرے میں چپکے چپکے ڈنر ہی کر لیا جائے۔ مگر وہاں گھور اندھیرا تو نہ تھا..... آم کے درختوں کے اوپر بے نور چاند ٹنگا ہوا تھا۔ گھر گھر گھر..... ایک جیپ آکر رکی۔ "ہیلو جنٹلمین! "ایک پھنسی پھنسی آواز آئی۔ میں نے مرغی کی ٹانگ رکھ کر اندھیرے میں گھورا۔ ایک چھوٹے سے قد کا آدمی جس کا سر کوٹ کے اندر چھپا ہوا تھا اور جس نے اپنے دونوں ہاتھ غالباً سردی کے خیال سے پتلون کی جیب میں ٹھونس رکھے تھے سامنے کھڑا تھا۔ "میں کرنل مجاہد ہوں..... آج کے حملے کی قیادت میرے سپرد ہے" ۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ "جناب مگر حملہ کب ہوگا..... آج سارا دن اسی انتظار میں گزرا ہے"

"حملے کا وقت طے کیا جا رہا ہے۔ آپ لوگ صحافی ہیں مجھے صحافیوں سے بہت دلچسپی ہے میں نے پنجاب یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا ہے" . کرنل مجاہد باتونی آدمی تھے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک ہدایت ملی کہ یہاں سے بھی کوچ کرنا ہے۔ میجر شیرازی نے آکر کہا کہ ٹرالر کو یہیں چھوڑ دیں کیونکہ میدان جنگ میں یہ ٹرالر تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹرالر کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا دیا گیا اب ہم لوگ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں اونچے اونچے درخت تھے ایک طرف کھیت اور دوسری طرف دور تک جاتی ہوئی سڑک تھی۔ میجر شیرازی نے بتایا کہ معاملات کچھ گڑبڑ ہوگئے ہیں۔ دشمن نے ایک اور محاذ پر اپنا دباؤ بڑھا دیا ہے۔ شاید ہمیں حملے کے لئے ابھی مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے۔

گولیاں، دھماکے اور روشنی کے گولے

رات کافی ہو چکی تھی، سردی سے دانت بج رہے تھے۔ ہم لوگ جیپ میں بغلوں میں ہاتھ

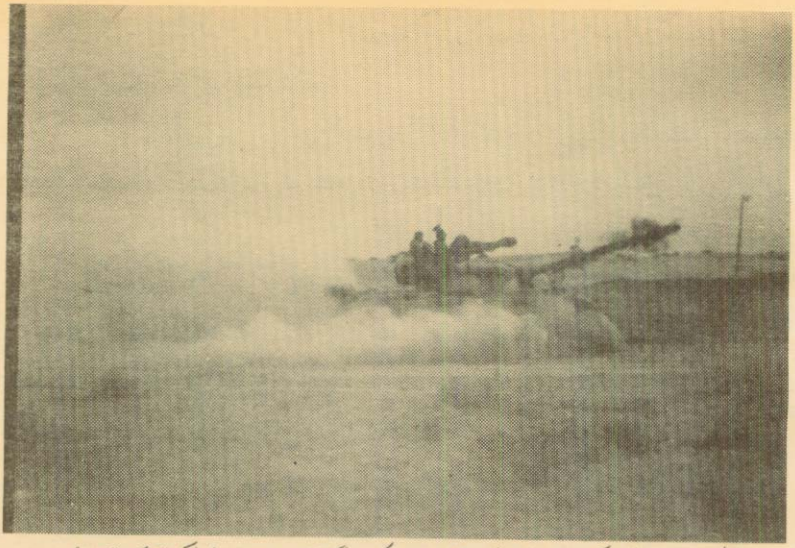

دیئے بیٹھے رہے، ڈرائیور کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا، سمٹا سکڑا سو گیا تھا۔ خانزادہ خبر لیکر آیا کہ آپریشن روم میں بڑی گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے ایبیائروں سے اختلاف ہو گیا ہے۔ حملے کے انتظار میں ہم سوکھتے رہے۔ یہاں تک کہ مایوس ہو گئے۔ ابھی ہم اسی امکان پر سوچ رہے تھے کہ واپس چلا جائے کہ اچانک روانگی کا بگل بجا۔ جیپ آڑے ترچھے اونچے نیچے راستوں سے ہوتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ کر رکی جس کے سامنے حد نگاہ تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جس میں کہیں کہیں فصلیں کھڑی تھیں۔ جیپ سے چھلانگ مار کر ہم لوگ اترے۔ اور کھیت میں داخل ہو گئے۔ کرنل مجاہد اپنے افسروں کے ہمراہ کھڑے تھے۔ اب جو ہم نے غور سے دیکھا تو دور تک فوجی جوان زمین پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ فوراً ہی پیش قدمی شروع ہوئی۔ اندھیرے میں بڑھتے ہوئے سینکڑوں سائے پر سرار لگ رہے تھے۔

"نعرہ تکبیر" کرنل مجاہد کی پاٹ دار آواز نے پوری قوت سے نعرہ لگایا۔ "اللہ اکبر" سینکڑوں پر جوش آوازوں نے جواب دیا۔ اور پھر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے لئے آگے کی جانب دوڑ پڑے۔ اس جوشیلی فضا میں، میں نے جو ادھر ادھر دیکھا تو میرے تینوں ساتھی غائب تھے۔ اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں کرنل مجاہد کے ساتھ رہوں۔ ہر طرف گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تڑ تڑتڑ، دھما دھم، تڑاخ پھڑاخ..... کان پڑی آواز سنائی نہیں

دے رہی تھی۔ بھاگتے قدموں کا شور، فصلوں کے بھاری بوٹوں تلے چرمرانے کا شور، بندوقوں کے کھولنے اور ان میں میگزین بھرنے کا شور۔

"شاباش کیپٹن حمید..... دشمن پر ٹوٹ پڑو" کرنل مجاہد وائرلیس پر چیخ رہے تھے۔ "بڑھے چلو، بڑھے چلو" ہم سب بھاگ رہے تھے۔ دوڑ رہے تھے۔ دور سے جوابی فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔

یکایک روز دار دھماکے شروع ہوئے اور آسمان پر روشنی کے گولے چھوٹنے لگے۔ روشنی کے گولے جو دھماکے سے چھوٹتے اور پھر آسمان سے آہستہ آہستہ روشنی کے گہرے ہالے کی صورت میں نیچے اترنے لگتے جس سے گرد و پیش کا سارا ماحول روشن ہوجاتا۔ مجھے یاد آیا کہ بریگیڈیئر امجد شعیب نے اسی گولے کے بارے میں بتایا تھا کہ اس سے دشمن کی نقل و حرکت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ دشمن کہاں کہاں چھپا ہے۔ اچانک فصلوں کے ساتھ ساتھ ہمیں لوھے کے خود اور خاکی وردی پہنے فوجی دکھائی دینے لگے۔ وہ خاموش کھڑے تھے اور بے بسی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ یہ بلیو لینڈ کے فوجی تھے جو جنگی قواعد کے مطابق ضائع ہو چکے تھے، مر چکے تھے یا شہید ہو چکے تھے۔ بلیو لینڈ..... ایک چھوٹی طاقت کے محافظ۔ یہ میرے محافظ تھے اور میں ایک جارح قوت..... فاکس لینڈ کے ایک کرنل کے ہمراہ تھا۔ دوڑتے دوڑتے ہم کئی فرلانگ نکل آئے تھے اب یہاں سے ہمیں وہ نہر دکھائی دینے لگی تھی جسے بلیو لینڈ کی فوج نے دو گھنٹے کے اندر اندر تین پل بنا کر عبور کر لیا تھا، اور اپنے بھاری ٹینکوں اور توپ خانوں اور فوجیوں کو اسی پر سے گزار لیا تھا۔ اور فاکس لینڈ کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس قبضے کو ختم کرانے کے لئے فاکس لینڈ نے رات کے اندھیرے میں حملہ کیا تھا۔

"شاباش میرے شیر" کرنل مجاہد وائرلیس پر چیخ رہے تھے۔ "میں تمہارے لئے نشان حیدر کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

میں کیمرے سے دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہا تھا۔ روشنی کے چھوٹنے والے گولے میری مدد کر رہے تھے۔

حملہ کامیاب ہو چکا تھا۔

کرنل مجاہد ہیلی کاپٹروں سے مبارکباد وصول کر رہے تھے۔ لیکن میں کہاں نکل آیا تھا؟ میرے بقیہ ساتھی کہاں تھے؟ میں واپس کیسے لوٹوں گا؟ ان سوالات نے مجھے ایک دم پریشان کر دیا۔

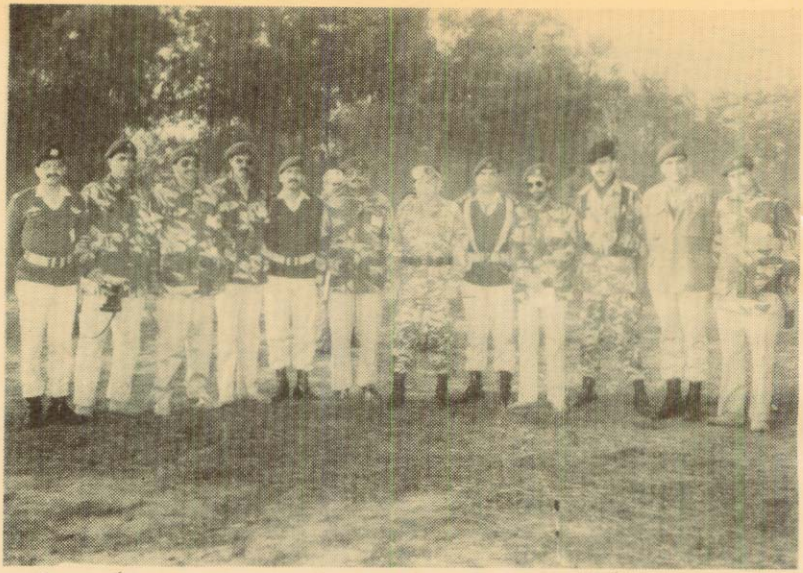

ضرب مومن کی فوجی مشقوں سے واپس آتے ہوئے آخری دن ہماری ملاقات فاکس لینڈ کے کمانڈر جنرل جان عالم محسود سے ہوئی۔ وہ اس بات پر خفا تھے کہ فاکس لینڈ کو دشمن کی فوج تصور کر لیا گیا ہے اور اخبارات اس کی شکست کے قصے بڑھ چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی پاکستانی فوج ہے اور اس نے بھی ان مشقوں میں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ شاید جنرل محسود کی بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی لیکن اس کے بغیر اصلی جنگ کا تاثر پیدا بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"ضرب مومن" پاک افواج کی جنگی مہارتوں کا امتحان تو تھا ہی لیکن یہ ہم لوگوں کی صحافیانہ مہارت کے لئے بھی ایک چیلنج تھا۔ ایک صحافی کو روزانہ اپنا قلم استعمال کرنا پڑتا ہے لیکن ایک فوجی کو ساری زندگی اسی ہتھیار کو اٹھائے رکھنا پڑتا ہے، جس کی ضرورت ایک بار پڑتی ہے۔

ملتان واپسی پر فوجی چھاؤنی میں فوجی بینڈ گروپ نے دھن بجائی "اے مرد مجاہد جاگ ذرا پھر وقت شہادت ہے آیا"۔ کراچی پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ ہم جاگنے کے بجائے خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہیں۔

اچانک میری نگاہ جیپوں اور گاڑیوں کے نزدیک کھڑے فوجی افسران پر پڑی۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں نقشہ پھیلائے مفتوحہ علاقے کی حد بندی طے کر رہے تھے۔ انہی میں میجر جنرل چوہدری نواز بھی تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس بات پر خوشی کا

اظہار کیا کہ میں میدان جنگ میں مسلح افواج کے ساتھ ہوں۔ دوران گفتگو انہوں نے گرم گرم چائے اور بسکٹ سے میری تواضع کی اور پھر میری درخواست پر انہوں نے ایک بریگیڈیئر صاحب کو ہدایت کی کہ وہ مجھے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیں۔ بریگیڈیئر صاحب بھی آگے کہیں جارہے تھے۔ ہیٹر سے گاڑی کی اندرونی فضا گرم تھی۔ راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ بھٹکتے بھٹکتے جب ہم نیم آبادی والے علاقے میں آئے تو اچانک ایک ہوٹل کے سامنے اپنی جیپ کھڑی نظر آئی، جس میں میرے بچھڑے ہوئے ساتھی سوار ہو رہے تھے۔

"بریگیڈیئر صاحب گاڑی روک لیجئے" میں چیخا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

میرے تینوں ساتھی تو اس طرح بغل گیر ہوئے جیسے میدان جنگ میں انہیں میری شہادت کا یقین ہو گیا ہو۔ وہ گھنٹے بھر تک مجھے تلاش کرنے کے بعد مایوسی کی حالت میں واپس جارہے تھے۔ اب ہمیں کیپٹن حبیب اور دیگر ساتھیوں کے ٹھکانے کی تلاش تھی اور جس کا پتہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ ہماری جیپ جس تنگ سڑک پر دوڑ رہی تھی اس کے چاروں طرف ویرانہ تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور سرد ہوا کے جھونکوں نے ہمیں برف کی طرح یخ کر دیا تھا۔ ایک ریسٹ ہاؤس نظر آیا تو جان میں جان آئی۔ جونہی جیپ سڑک سے اتر کر مڑی پہاڑی سے ایک سائے نے برق رفتاری سے چھلانگ لگائی "ہالٹ" ایک چیخ سناٹے کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ سائے کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور وہ جیپ کے سامنے پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔ اس اچانک حملے کے لئے ہم میں سے کوئی بھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ یکایک ذہن میں بریگیڈیئر احمد شعیب کا بتایا ہوا PASS WORD گونجا۔ "بلب" ہم نے کپکپاتی آواز میں کہا، ہمارے خیال میں اسے جواب میں "آدمی" کہنا چاہئے تھا لیکن سایہ خاموش رہا۔

"لائٹ آف کرو" وہ چلایا، ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی کی بتی گل کر دی اور پھر دونوں ہاتھ اٹھائے گاڑی سے نیچے اترا۔ ذرا دیر کی گفت و شنید کے بعد وہ واپس لوٹا تو پتہ چلا کہ ہم غلط جگہ آگئے ہیں اور یوں جیپ دوبارہ سڑک پر روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہمیں سڑک پر چند آدمی کھڑے نظر آئے، وہ اشارے سے جیپ کو رکنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ان میں کیپٹن حبیب کا بیٹ مین بھی تھا جس نے ہمیں فوراً پہچان لیا اور یوں ہمارا یہ پریشان کن سفر ختم ہوا۔ اگلی صبح کیپٹن حبیب اور دیگر صحافیوں نے ہم چاروں کو اپنے درمیان پاکر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور جب ہم لوگوں نے انہیں بتایا کہ کس طرح ہم نے میدان جنگ اور لڑائی کا نظارہ دیکھا تو انہوں

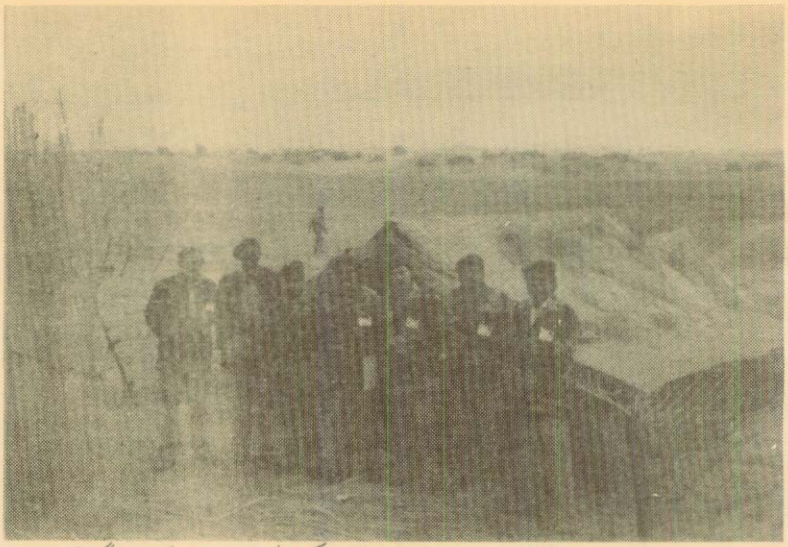

نے ہمیں اس ایڈونچر پر مبارک باد دی۔ دوپہر میں ایک کھلے ٹرک پر سوار ہو کر ہم لوگ ایک ایسے محاذ کی جانب روانہ ہوئے جو نسبتاً اونچائی پر واقع تھا۔ ریت، جھاڑیاں اور پتھریلے راستے کو عبور کرتے ہوئے جب ہم وہاں پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ یہاں سے نیلا آسمان بہت قریب تھا۔ ایک نوجوان کیپٹن نے ہمیں چیلنج کیا کہ اس جگہ پر بہت سی گنیں نصب ہیں آپ لوگ اسے تلاش کر لیں تو ہم آپ کی ذہانت کے قائل ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے سوائے کیپٹن حبیب کے کوئی بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گنوں کو اس سلیقے اور مہارت سے کیمو فلاج کیا گیا تھا کہ دور سے صرف جھاڑیوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے۔ یہاں ہماری ملاقات نیشنل کیڈٹ کورس کے دو اسکاؤٹس شفیق احمد اور شاہجہاں سے ہوئی۔ یونیفارم اور کیپ میں وطن کے ان ننھے محافظوں کا تعلق اندرون سندھ سے تھا انہوں نے صحافیوں سے شکایت کی کہ وہ ایسے مضامین کیوں نہیں لکھتے جنہیں پڑھ کر سندھ کے نوجوانوں میں بھی پاک فوج میں بھرتی ہونے کا جذبہ پیدا ہو۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ حصول تعلیم کے بعد نہ صرف خود فوج میں شامل ہوں گے بلکہ واپس جاکر اپنے دوستوں کو بھی اس پر آمادہ کریں گے۔ کیپٹن فضل محمود ہمیں صحرا میں نصب گنوں کے بارے میں بتانے لگے کہ یہ دو ہزار میٹر تک مار کر سکتے ہیں۔ اتنی دور سے نشانہ صحیح کیسے لگ سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے یہ دلچسپ بات بتائی کہ ہمارے جاسوس دشمن کے علاقے میں جاکر چھپ جاتے ہیں اور وہاں سے

وائرلیس پر ہمیں ہدایات دیتے ہیں اور ان کی ہدایات کی روشنی میں گنوں کی نال کا رخ صحیح سمت میں کر دیا جاتا ہے جس کے بعد دشمن کی چوکیوں اور مقامات پر ٹھیک ٹھیک حملے کئے جاسکتے ہیں۔ شام کی چائے کے لئے کھلے آسمان کے نیچے میز بچھائی جاچکی تھی، چائے اور بسکٹ سے لطف اندوز ہونے کے بعد جب ہم لوگوں نے اجازت چاہی تو بتایا گیا کہ رات کا کھانا کھائے بغیر ہم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے۔ اتنی دیر میں کیپٹن مطاہر اور لیفٹننٹ حیدر علی سے میری دوستی ہو چکی تھی۔ یہ دونوں بے حد پر جوش نوجوان تھے۔ ۱۶ دسمبر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دن گزرے ہوئے شاید دو ایک ہی روز ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "کیا فوج کو ۷۱ء کی شکست یاد ہے؟"

کیپٹن مطاہر نے جذباتی لہجے میں جواب دیا "ہم اس شکست کو کیسے بھلا سکتے ہیں، یہ تو ایک ایسا داغ ہے جسے ہمیں ہر صورت میں دھونا ہے۔ اگر کبھی ہم پر جنگ مسلّط کی گئی تو ہم اب پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ۷۱ء کی جنگ تو کوئی جنگ ہی نہیں تھی، اس میں ہم کہاں لڑے، ہمارے ایک میجر صاحب اس جنگ میں جنگی قیدی بنے تھے۔ وہ ہمیں ان دنوں کے واقعات سناتے ہیں جب بھارت کی قید میں انہیں ذلیل کیا جاتا تھا، بے عزتی کی جاتی تھی، ظلم کیا جاتا تھا۔ یہ واقعات سن کر ہمارا خون کھول اٹھتا ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ کبھی ایسا موقع آیا تو یہ سارے حساب کتاب چکانے ہیں۔"

لیفٹننٹ حیدر علی نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "ہمارے سیاستداں سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کریں اور ملک کے سیاسی نظام کو ٹھیک طریقے سے چلائیں تو سرحدوں کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور انشاءاللہ دشمن سے چھوٹا ہونے کے باوجود ہم دشمن کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتے ہیں"۔ باتوں میں بہت دیر ہو گئی، میز پر کھانا چنا جاچکا تھا۔ کھانے کے بعد ہلکی پھلکی سی محفل مشاعرہ منعقد ہو گئی۔ "واہ واہ، سبحان اللہ" کے ڈونگرے برسے اور جب ہم وہاں سے واپس آرہے تھے تو بے حد خوش تھے، ہمیں یقین تھا کہ جس فوج میں کیپٹن مطاہر اور لیفٹننٹ حیدر علی جیسے نوجوان افسران موجود ہیں، اس پر قوم آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہے۔ پاک فوج کے جوانوں میں صرف جوش و جذبہ ہی نظر نہیں آیا، ہم نے ان کی جنگی اہلیت اور مہارت کے مظاہرے بھی آئندہ چند دنوں میں دیکھے۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح سے انہوں نے دریا کے پاٹ پر چند گھنٹوں کے اندر اندر ایک پل تعمیر کر کے اس پر سے پوری فوج ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں گزار دیں۔ ایک امریکی جنرل تو اس مہارت کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا "بے شک پاکستانی فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہے۔"

اسی طرح ہم نے ایک مورچے کو بڑے بڑے وزنی سلوں سے ڈھکا دیکھا جسے دیکھ کر ایک سعودی جنرل نے پوچھا تھا کہ "ان وزنی سلوں کو آپ نے کسی کرین کی مدد سے یہاں لگایا ہے؟" تو ایک پاکستانی فوجی افسر نے مسکرا کر جواب دیا "جی نہیں اسے ہمارے جوان اٹھالائے تھے، اس طرح کے چھوٹے موٹے کاموں کو ہم ہاتھوں سے ہی انجام دے دیتے ہیں" یہ سن کر سعودی جنرل حیرت زدہ رہ گئے اور کہا "ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے"۔ اور ایک رات جب ہم تقریباً دو ڈھائی بجے اپنے ٹھکانے کو لوٹ رہے تھے بارش سے تنگ سڑک کیچڑ سے ڈھک گئی تھی، ہم نے ایک یونٹ کو سارا سامان کندھوں پر اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ میلوں کا سفر اس بارش اور کیچڑ میں طے کریں گے، اتنی بے پناہ محنت' عزم مصمم اور سخت زندگی کا ہم شہروں میں رہتے ہوئے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ پاک فوج کیا ہے؟ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن کا سامنا ہے اسی لئے دفاع کی ساری ذمہ داری پاک فوج پر ڈال دینے کے بجائے پوری قوم کو ہی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔ لہٰذا جب ضرب مومن کے چیف امپائر جنرل حمید گل سے پوچھا گیا کہ "لازمی فوجی تربیت" کا نظام کیوں نافذ نہیں کیا جاتا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور یہ فیصلہ قوم ہی کر سکتی ہے کہ اسے اپنے دفاع پر کتنا خرچ کرنا چاہئے۔

قحط

شبنم بیگ ناز

اللہ ہے سب کا اَن داتا
ساری کائنات کا آقا

غلّہ خوب اُگانے والا
سب کی بھوک مٹانے والا

دولت میں ہو کثرت جس دم
اور خوراک میں برکت جس دم

اکثر انساں کھو جاتا ہے
دُور خُدا سے ہو جاتا ہے

جس خطّے میں قحط پڑا ہو
رزق کو انساں ترس گیا ہو

ہر جانب ہو بھوک کا ڈیرا
تنگ ہُوا ہو موت کا گھیرا

سمجھو اُن سے ظُلم ہُوا ہے
اُن سب سے ناراض خُدا ہے

قہرِ خُدا کو دعوت دی ہے
قحط کی اُن کو سزا ملی ہے

نازؔ خُدا سے ہر دم ڈرنا
اُس کی بتائی راہ پہ چلنا

جیون کا دستور بنا لو
آنکھیں میچ کے جنّت پا لو

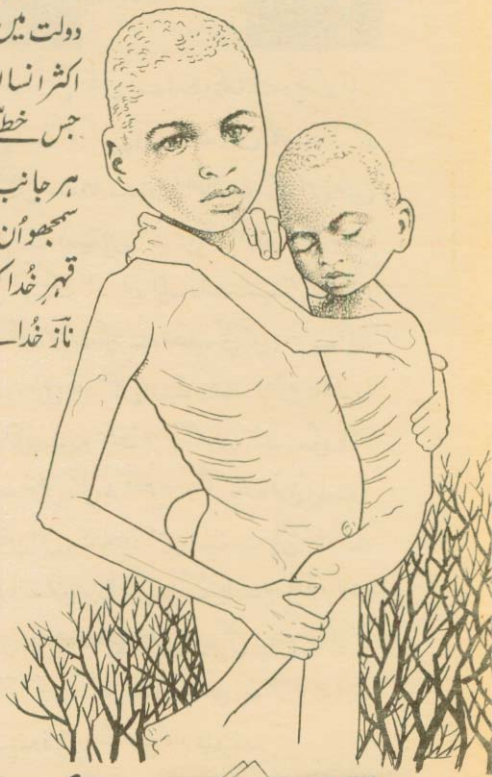

پراسرار آدمی

عظمیٰ تسنیم

علی کرکٹ کا بلا ہاتھ میں لئے اپنے وسیع و عریض محل نما گھر میں داخل ہوا۔ ہرے بھرے لان میں سے گزرتے ہوئے اس کی نظر لال کار پر پڑی تو خود بخود اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کار کا مالک ایک پراسرار آدمی ہے جو ہر چھ ماہ بعد اپنے بریف کیس سمیت ڈیڈی سے ملاقات کے لئے آجاتا۔ اس کی آمد سے ممی ڈیڈی کے چہرے پر دنیا بھر کے تفکرات سمٹ آتے۔ ڈیڈی اور وہ ڈرائنگ روم میں بند نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ علی نے ممی سے پوچھا بھی کہ،

"یہ آدمی کون ہے؟"

انہوں نے صرف یہی کہا۔ "تمہارے ڈیڈی کے دوست۔"

لیکن یہ جواب علی کو کھوکھلا سا لگا کیونکہ ڈیڈی کے تمام دوست مہذب اور اچھے تھے۔ جبکہ وہ ..... وہ عجیب سا حلیہ رکھتا تھا۔

"چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں عجیب سی مکاری تھی۔ بال کھچڑی، مونچھیں بڑی بڑی، اور دیکھنے میں دبلا پتلا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ چڑھائے رکھتا۔"

سب سے زیادہ الجھن علی کو اس بات پر تھی کہ جب بھی وہ آتا تو ممی، علی کو ڈرائنگ روم کے اندر تو کیا اس کے آس پاس تک نہ جانے دیتیں۔

آج بھی علی نے ممی سے پوچھا۔

"ممی میں ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی اپنی کتابیں لے آؤں۔" ممی نے تنبیہ کی۔

"نہیں بالکل نہیں۔ ابھی فوراً اپنے کمرے میں جاؤ۔" اور علی ناکام اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

سیٹھ سکندر شاہ شہر کے امیر کبیر آدمیوں میں شمار کئے جاتے۔ کیونکہ کپڑوں کے چار کارخانے ان کی ملکیت تھے۔ وہ اپنی بیوی سائرہ شاہ اور اکلوتے بیٹے علی سکندر کے ساتھ خوش و خرم رہ رہے تھے۔

علی تیرہ سال کا بڑا ہی ہونہار، بہادر اور ذہین بچہ تھا۔ والدین کی بہترین تربیت نے اس کی عادات و اطوار میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

پچھلے دو سال سے سیٹھ صاحب اس پراسرار شخص کی آمد سے بے انتہا پریشان تھے اور علی کی ممی بھی ان کی پریشانی میں شریک تھیں۔

علی کی جاسوسانہ طبیعت پراسرار شخص کا راز جاننے کے لئے بے چین تھی۔

"پلیز ممی جلدی تیار ہوں۔"

علی جوتے کی ڈوری باندھتے ہوئے بولا

"علی چاند میں تیار ہوں، چائے تو تھرماس میں ڈالنے دو۔" سائرہ شاہ یہ کہتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ اور علی ڈیڈی کو بلانے کھڑا ہو گیا۔

آج علی اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ پکنک پر جا رہا تھا۔ سب تیار تھے لیکن یہ کیا؟.....

لال کار گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ علی نے ڈیڈی کی طرف دیکھا جو کہ غصہ اور پریشانی

کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھے۔ ممی کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ پھر اگلے لمحے ڈیڈی اور وہ ڈرائنگ روم میں بند تھے۔ آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ چھپ کر ان کی گفتگو ضرور سنے گا۔

ممی اسے کمرے میں رہنے کی تاکید کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ وہ بھی اپنے کمرے کی طرف مڑا لیکن پھر ممی کو جاتا ہوا دیکھ کر چپکے سے ڈرائنگ روم سے ملحقہ گیلری میں پہنچ کر دروازے سے کان لگا دیئے۔

"تم..... تم کیوں آئے آج؟ ابھی پندرہ روز پہلے ہی تو....."

"سیٹھ غصہ کا ہے کو کرتے ہو انسان بے ضرورت کسی کے پاس نہیں آتا۔"

"بکواس مت کرو دو ہفتے پہلے تم پچیس ہزار لے گئے ہو....."

دیکھو سیٹھ ٹائم نہیں ہے۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"میں تمہیں بہت برداشت کر رہا ہوں۔" سیٹھ سکندر کی مری ہوئی آواز ابھری

"تھوڑا اور کر لو ورنہ..... تمہارا بیٹا گھر میں ہی موجود ہے۔ اور ویسے بھی اس کا اسکول کہاں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

اور دروازے سے لگا علی حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا کیونکہ گفتگو میں اس کا اور اسکول کا نام بھی استعمال ہو رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی شاید کوئی ملازم اس طرف آ رہا تھا علی فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔

آدمی کے جانے کے بعد تینوں پکنک کے لئے روانہ ہوئے۔ بظاہر تو وہ مسکراتے کھلکھلاتے پکنک کے مزے لوٹ رہے تھے۔ لیکن تینوں کے دلوں میں عجیب عجیب خیالات بھرے تھے۔ سیٹھ اور ان کی بیوی کے دل و دماغ پر پریشانیوں کا ڈیرہ تھا اور علی خواہ مخواہ کی الجھن میں مبتلا تھا۔

علی اسکول کا کام کرنے میں منہمک تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہیلو"

"ہیلو سیٹھ صاحب کو بلاؤ۔" دوسری طرف سے کرخت آواز آئی۔ علی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ اسی آدمی کی آواز ہے۔ علی ہولڈ کروا کر ڈیڈی کو بلا لایا۔

"ہیلو سکندر شاہ اسپیکنگ"

"تم" ڈیڈی چونکے اور علی کی طرف دیکھ کر اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا علی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گیا لیکن دروازہ سے باہر نکل کر کان لگا دیئے۔ ڈیڈی کی دبی دبی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے کل جمعرات ہے۔"

"خبردار جو تم آئے میں..... میں کل رات دس بجے آرہا ہوں۔" ڈیڈی نے یہ کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔

علی نے ایک زبردست اسکیم سوچی اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

سردیوں کی سرد ترین رات تھی۔ سب ہی لحافوں میں دبکے سردیوں کی شدت کم کرنے میں مصروف ہوں گے ٹھنڈی ہواؤں کے تھپڑے کو چیرتا ہوا ایک ننھا سایہ گیراج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کار کی ڈگی کھلی اور وہ سایہ اس میں اچھی طرح سما گیا۔

گھڑی کی سوئیاں پونے دس پر آئیں اور سیٹھ سکندر چپکے سے اپنی کار کی طرف بڑھے۔ علی ڈگی میں بیٹھا کانپ رہا تھا۔ لیکن یہ سردی اس وقت کم ہوتی چلی گئی جب اس کے اندر راز معلوم کرنے کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔

لمبی مسافت طے کرنے کے بعد کار رک گئی۔ علی نے کار سے ڈیڈی کو اتر کر سامنے چھوٹے سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ علی بھی ڈگی سے اتر کر دبے پاؤں ان کے پیچھے چل پڑا، چھوٹا صحن عبور کر کے وہ اس کمرے کے دروازے پر رک گیا جہاں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

"خوش آمدید سیٹھ، آخر ہمارے غریب خانے تم آ ہی گئے" اس آدمی کی آواز ابھری۔

"جابر تم انسان نہیں شیطان ہو۔" ڈیڈی نے دکھ میں ڈوب کر کہا "روتے کیوں ہو سیٹھ، اب دیکھو اگر میں ہر چھ ماہ بعد تم سے پچیس ہزار نہ لوں تو یہ میری کم بخت زبان کہاں چپ رہے گی۔ اسی زبان کی کھاتر (خاطر) ہم تجھے تنگ کرتے ہیں۔"

"بس بس چپ رہو۔ یہ میری تمہاری آخری ملاقات ہے۔ آئندہ میں تمہیں کچھ نہ دوں گا۔"

"تم کچھ نہ دو تو میری زبان چل پڑے گی اور دنیا کو بتا دے گی تمہارا اکلوتا بیٹا جس کو تم بہت

چاہتے ہو وہ تمہارا نہیں بلکہ یتیم خانے کا لاوارث ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ایک ماہ کے علی کو تمہیں دیا تھا تحریری ثبوت میرے پاس ہے۔" آدمی نے سفاکی سے راز کا پردہ اٹھایا۔

"بتادو دنیا کو، مجھے دنیا کی پرواہ نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں میرے علی کو یہ نہ پتا چلے۔" سیٹھ کی گڑگڑاہٹ ابھری۔

یہ سننا تھا کہ علی کے ہاتھ پاؤں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈے ہوگئے۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ وہ مزید کچھ سنے بغیر ڈگی میں واپس بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بے شمار لڑیاں نکلی جارہی تھیں۔ ممی ڈیڈی اس کے سگے ماں باپ نہیں۔ وہ یتیم ہے۔

یا خدا مجھے حوصلہ دے .....

اچانک اس کی نظر میز پر رکھی تصویر پر پڑی وہ ممی پاپا کے درمیان ہنستا ہوا بیٹھا تھا اور ممی پاپا کی نظروں میں اسکے لئے پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ علی کے جذبات بدلنا شروع ہوگئے۔

"ڈیڈی نے صرف اور صرف میری خاطر اس آدمی کے قدموں میں اتنی دولت بکھیر دی۔ ممی ڈیڈی نے تیرہ سال تک میرے ہر آرام کا خیال رکھا۔ میں بھی..... میں بھی انہیں اس آدمی سے نجات دلاؤنگا۔" یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگیا۔

لال کار گیٹ میں داخل ہورہی تھی۔ دوسرے لمحے ڈرائنگ روم میں اس آدمی کے ساتھ ممی ڈیڈی بھی موجود تھے۔

علی بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ ممی کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ ڈیڈی پریشان بیٹھے تھے اور وہ آدمی مکاری سے مسکرا رہا تھا۔

"جابر صاحب آپکا ڈرامہ ختم ہوا۔" علی نے چیخ کر کہا۔

"علی تم جاؤ یہاں سے جاؤ۔" سیٹھ صاحب نے اسے ڈانٹا۔

"سیٹھ اپنے لونڈے کو پرے ہٹاؤ۔ ورنہ ....."

"ورنہ کیا یہی نا کہ تم مجھے بتادو گے کہ میں ان کا سگا بیٹا نہیں تو بتادو۔ مجھے کیا ساری دنیا کو بتا دو۔"

"علی" سکندر شاہ اور سائرہ شاہ ایک ساتھ چیخے۔

"ہاں ڈیڈی مجھے اس بلیک میلر کے تمام کرتوتوں کا علم ہو گیا ہے۔"

جابر بریف کیس سنبھالے کمرے سے باہر بھاگا لیکن باہر انسپکٹر کاشان اس کے منتظر تھے انہیں علی نے بلوایا تھا۔ اگلے لمحے جابر ہتھکڑیاں پہنے سیٹھ سکندر کی کوٹھی سے جا رہا تھا۔ کبھی نہ آنے کے لئے۔

ممی ڈیڈی اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہے اور وہ بھی ان سے لپٹ گیا۔ ان والدین سے جو سگے نہیں تھے مگر سگے والدین سے بڑھ کر تھے۔

آنکھ مچولی دعوتِ تحریر

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

زبانیں اظہار کا وسیلہ ہیں ـــــ زبانیں پیغام کے تبادلے کا ذریعہ ہیں
ہماری سرزمین پر بولی جانے والی سب زبانیں ـــــ میٹھی سُندر اور پیاری ہیں

آیئے اپنی دھرتی کی سب زبانوں سے پیار کا اظہار کریں

ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں میں ایک ہی موضوع پر مضمون لکھنے کی دعوت دے رہا ہے

سندھی ، بلوچی ، پنجابی اور پشتو میں سے آپ جس زبان میں بھی چاہیں ایک مختصر سا مضمون لکھئے ...

موضوع ہے ... "قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

قابلِ اشاعت مضامین کو تحائف بھجوائے جائیں گے

- ۳۱ مارچ ۱۹۹۰ء مضمون بھجوانے کی آخری تاریخ ہے۔
- تحریر صاف ، خوش خط اور کاغذ کے ایک جانب لکھیں۔
- جس صفحے پر مضمون لکھیں اُس کی پُشت پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔
- مضمون دو فل اسکیپ صفحے سے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیئے۔

"آنکھ مچولی" دعوتِ تحریر " ڈی ، ۱۱۲ ، سائیٹ کراچی نمبر ۱۶

پچھلے کئی دنوں سے ننھا علی کھانے کے لئے عجیب طرح کی ضدیں کرنے لگا ہے۔ کھاتا پیتا کچھ بھی نہیں بس وقت بے وقت طرح طرح کی چیزوں کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔ ابھی کل پرسوں کی بات ہے رات کو کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب سوتے سوتے اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا "مجھے آئس کریم کھانی ہے" اب بھلا رات کے ڈیڑھ بجے آئس کریم کی کون سی دکان کھلی تھی کہ ہم اسے آئس کریم دلوا کر لاتے۔ بڑی مشکلوں سے بہلا پھسلا کر خوشلدیں کر کے اسے سلایا۔ اسی طرح ایک دن بیٹھے بیٹھے انڈا کھانے کا اعلان کر دیا، اور پھر یہ کہ فوراً کھانا ہے انڈا، پھر انڈے کو دیگچی میں ڈال کر پکانے سے پہلے ہی اس نے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ انڈے کو پکانے وکانے کی ضرورت نہیں بس ایسے ہی کھا لیتے ہیں۔ اور پھر انڈے کو اس طرح دبوچنے اور جھپٹنے سے جو حشر انڈے کا ہوا اس کو دیکھ کر علی حیران وششدر رہ گیا کیونکہ انڈا علی کے ہاتھ میں پچک کر ٹوٹ چکا تھا اس کے ہاتھ اور کپڑے سب خراب ہو چکے تھے۔ اور علی اپنا رونا دھونا سب کچھ بھول چکا تھا وہ بڑے غصے سے اس انڈے کو دیکھ رہا تھا جس نے علی کا حشر خراب کر دیا تھا۔ ابھی کل دوپہر کی ہی تو بات ہے میں باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی تو علی کھیلتا کھیلتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ماما" ماما مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو دیں؟" اتفاق سے اس وقت تک مٹر پلاؤ میں نے پکا لیا تھا۔ میں نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا مٹر پلاؤ نکالا۔ اس پر تھوڑی سی دہی اور ٹماٹر وغیرہ ڈال کر پلیٹ اور چمچا علی کے سامنے رکھ

یہ دل کا معاملہ ہے

زہرہ

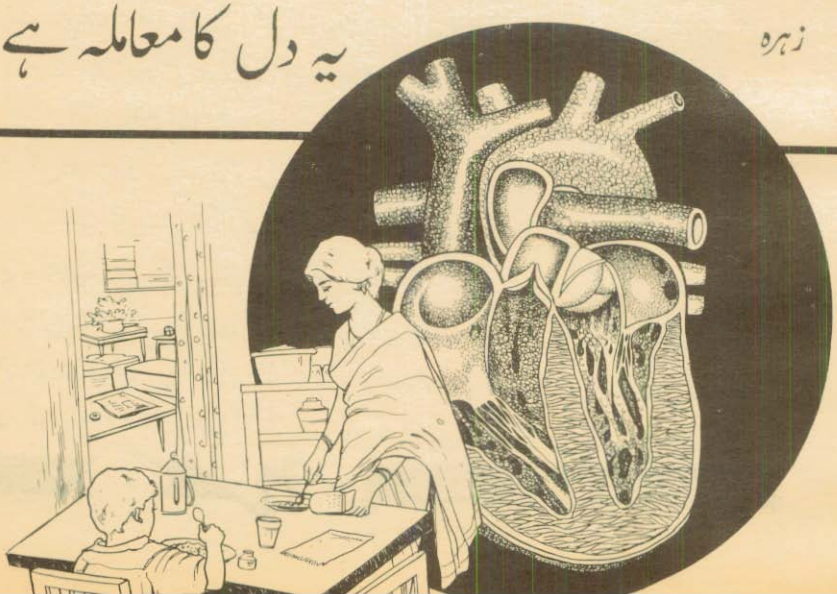

دیا۔علی نے بڑے شوق سے کھایا۔ پھر دوبارہ اور مانگا اور خوش ہو ہو کر بڑے شوق سے کھاتا رہا۔ میں نے پوچھا علی کیا بات ہے ؟۔ آج تو بڑے خوش ہو ہو کر بڑے شوق سے کھا رہے ہو۔ کیا یہ مٹر پلاؤ بہت مزے کا ہے؟ بہت اچھا لگ رہا ہے تمہیں؟ آخر معاملہ کیا ہے؟ علی نے بے ساختہ لہک لہک کر کہنا شروع کیا۔ "یہ دل کا معاملہ ہے" یہ دل کا معاملہ ہے۔ مجھے علی کے اس بے ساختہ جملے پر بہت ہی ہنسی آئی۔ اور جب میری ہنسی کچھ کم ہوئی تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ واقعی یہ کسی چیز کو کھانے کی خواہش دل ہی کا تو معاملہ ہے۔یہ ذکر تو تھا خیر ایک ننھے منے علی اور علی ہی جیسے دوسرے ننھے منے بچوں کی ضد کا۔ لیکن ہم بڑے بھی کھانے پینے کے معاملے میں ان بچوں سے کم تو نہیں ہیں۔ زبان کے چٹخاروں سے تو ہم بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ روزانہ طرح طرح کے نئے نئے کھانے کھانے کو تو ہمارا بھی دل چاہتا ہے۔ کبھی ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم گرما گرم پراٹھے اور سیخ کباب کھائیں کبھی دل چاہتا ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی رس ملائی کھائی جائے۔ کبھی چٹ پٹے دہی بڑے اور آلو چھولوں کی چاٹ پر ہاتھ صاف کرنے کو دل چاہتا ہے اور کبھی خوابوں میں املی کی ڈھیری یا کچے آموں کو دیکھ دیکھ کر سوتے سوتے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا کبھی ہم سب نے مل کر یہ سوچا ہے؟ آخر وہ کیا سبب ہے کہ جو ہر روز ہمیں نیا کھانا کھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آخر وہ کس قسم کی بھوک ہے؟ جو ہمیں سوتے سے جگا دیتی ہے۔ اور ہمیں بیدار کر کے کھانے پر مجبور کر دیتی ہے؟

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کھانا کھانے کی خواہش کا تعلق ہمارے دل اور دماغ کی اس کیفیت سے ہے جسے ہم موڈ کہتے ہیں، یعنی موڈ یا مزاج اور کھانے کا آپس میں گہرا ناطہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ہماری بھوک کا انحصار ہمارے موڈ پر ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم اسی وقت کھانا کھائیں جب ہم بھوکے ہوں، بلکہ اکتاہٹ، تھکاوٹ، پریشانی اور گھبراہٹ میں بھی ہمارا کچھ نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے۔ چاہے ہمارا پیٹ کتنا ہی بھرا ہوا کیوں نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تو سائنس دان اپنے تجربے و تحقیق کی بنا پر یہ جواب دیں گے کہ خوراک اور مزاج کا تعلق کُلیتاً جسمانی اور نفسیاتی ہے۔ خوراک اور مزاج کے اس تعلق کو کسی حد تک جذباتی بھی کہا جا سکتا ہے، وہ اس لئے کہ بعض کھانوں سے ہماری خواہشات کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً کڑھائی گوشت دولت اور رتبے کی علامت ہے۔ ایک عام آدمی اس کو بھلا کیسے افورڈ کر سکتا ہے۔ آلو کے بھرتے سے سکون اور سلامتی کا اظہار ہوتا ہے۔

پیاز، چٹنی اور روٹی اور ساتھ میں دہی کی لسی سے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ آئس کریم کھاتے وقت بے فکری کا سا احساس ہونے لگتا ہے۔

خوراک اور مزاج کا جسمانی تعلق اس طرح سے ہے کہ بعض کھانے ہمارے موڈ کو ہی تبدیل کر دیتے ہیں کیونکہ ان میں کچھ ایسے کیمیائی اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ جن سے ہمیں سکون ملتا ہے۔ یا ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے موڈ کو تبدیل کر دینے کی غذا میں جو صلاحیت ہوتی ہے اس کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہم تھکے ہوئے ہوتے ہیں تو چائے پینے کو دل چاہتا ہے اور سوتے وقت دودھ کی خواہش ہوتی ہے جس سے ہمیں سکون ملتا ہے اور نیند آجاتی ہے۔ مہم جوئی اور ہیجانی کیفیت کے وقت یعنی کسی سینما ہال میں پکچر دیکھتے ہوئے یا کوئی کھیل کا میچ وغیرہ دیکھتے وقت مونگ پھلیاں یا ایسی ہی کوئی سخت چبانے والی چیز کھانے کو دل چاہتا ہے۔ تھکن کی صورت میں کوئی ایسی نرم چیز کھانے کو دل چاہتا ہے جو بغیر چبائے معدے میں اتر جائے، جیسے حلوہ یا کھیر، سوپ یا جوس وغیرہ۔ موٹے آدمی نرم غذا اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ سہل پسند ہوتے ہیں، اور ایسی غذا کو چبانے میں انہیں محنت نہیں کرنا پڑتی نہ ہی ان کے دماغ پر بار پڑتا ہے۔

غذا کی ساخت کے علاوہ غذا کا درجہ حرارت بھی ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے، مثلاً توے سے اتری ہوئی گرم گرم چپاتیاں یا کڑھائی سے نکلتی ہوئی گرم گرم پوریاں اور گرم پکوڑے، پکانے والے کی محبت اور خلوص کا احساس دلاتے ہیں، ان سے ہمیں گھر اور گھر والوں کی محبتوں کی بُو آتی ہے۔ بیماری کی حالت میں گرم نرم کھچڑی، گرم یخنی اور سوپ سے ہم خود کو بڑا محفوظ خیال کرتے ہیں۔ اور ہم یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارا خیال کیا جا رہا ہے، ہماری دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ بعض کھانوں کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں، جیسے املی اور جھڑبیری کے لال پیلے بیروں کو دیکھ کر بچپن کے دن یاد آجاتے ہیں۔ شیر خورما کو دیکھ کر عید کے دن دوستوں کا مل بیٹھنا یاد آجاتا ہے۔

یہ سن کر آپ ضرور حیران ہوں گے کہ میکسیکو، اسپین اور اٹلی جیسے ممالک جن کی فضاؤں میں سمندری بھاپ زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ گرما گرم چٹ پٹے اور مصالحے دار کھانے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ گرم موسم سے جسمانی آعمال ست پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ لوگ سہل پسند ہو جاتے ہیں، اس سستی اور کاہلی کا ازالہ کرنے کے لئے، اپنے جسمانی آعمال اور بھوک میں

اضافہ اور تیزی پیدا کرنے کے لئے چٹ پٹے اور مصالحے دار کھانے پسند کیئے جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے، اور جسم کے زیادہ حرارے جلنے لگتے ہیں۔ جبکہ انگلینڈ اور جرمنی جیسے ٹھنڈے ممالک کے لوگ نیم گرم، خوش ذائقہ اور آرام دہ کھانے پسند کرتے ہیں، جیسے آلو کا بھرتہ اور دُم پخت وغیرہ۔ ٹھنڈے موسم کی وجہ سے ان کے آعمال میں پہلے ہی سرعت اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے بھوک کو بڑھانے کے لئے چٹ پٹے کھانوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تجربات سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ جو لوگ نہایت تیز دھن کی موسیقی یا پرجوش ماحول میں کھانا کھاتے ہیں وہ نہایت تیزی سے کھاتے ہیں۔ اور زیادہ کھاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ پر سکون ماحول اور موسیقی کی مدھم دھن پر کھانا کھاتے ہیں وہ آہستہ کھاتے ہیں اور کم کھاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے مستقبل کے سائنس دانوں میں کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو ہماری شکل دیکھتے ہی ہوٹل کے ویٹر کو ہمارے موڈ کے مطابق کھانا فراہم کرنے کا آرڈر دے دے یا اس سے کہے کہ اس گاہک کو ایسا کھانا کھلاؤ جس سے اس کا موڈ تبدیل ہو جائے یا جو اس کے موڈ سے مناسبت رکھتا ہو۔ پھر کتنا لطف آئے گا جب ایسا ہونے لگے گا ادھر ہم نے سوچا اور ہماری سوچ کی مناسبت سے کھانا ہمارے سامنے ہو گا۔

قصّہ مختصر خوراک اور مزاج کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح گوشت کو ناخن سے جدا کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح خوراک کو مزاج سے جدا کرتے ہوئے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہمارا مزاج اور ہماری زبان کھانوں کے نت نئے مزے اپنی قدرتی خواہش کے مطابق معلوم نہ کرتی اور ہمیں اچھے بُرے ذائقوں کا پتہ نہ چلتا تو بھلا کیا ضرورت تھی اس تردّد کی بس ایک ہی قسم کے کھانے ہم کھاتے رہتے۔ اور ہر روز ایک نیا کھانا، نیا ذائقہ تیار کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ وہ تو دعا دیجئے اپنے اس موڈ کو کہ جس نے ہمیں کافر بنا دیا، کہ جس نے انسان کی اس ہر روز نیا کھانا کھانے کی اولین بنیادی خواہش کو کھانا بنانے کے بھی نئے نئے انداز سکھا ڈالے۔ باورچی خانوں کو ویران ہونے سے بچالیا۔ اس کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیا۔ اسی لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو کچھ کھایا جائے خوش ہو کر کھایا جائے۔ ناگواری سے کھانا کھانے سے کہیں یہ بہتر ہو گا کہ آپ ایسے کھانے پر اپنی توجہ مرکوز کریں جس سے آپ کی جسمانی بھوک کے ساتھ ساتھ آپ کی نفسیاتی بھوک کی بھی تسکین ہو جائے۔

نئی دنیا

فرزانہ روحی

شہر میں ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ تیسری مرتبہ لسانی فسادات نے سر اٹھایا تھا۔ معصوم افراد فساد کی نذر ہوتے جارہے تھے۔ جھگڑے کو روکنے کے لئے انتظامیہ ایک علاقے میں کرفیو لگاتی تو دوسری طرف ہنگامے شروع ہوجاتے۔ آئے دن کے ہنگاموں نے کاروبار زندگی کو معطل کر دیا تھا۔ زبردست جانی ومالی نقصان بھی ہوا تھا۔ تمام تعلیمی ادارے بند تھے۔ پرندوں کی طرح آزاد ادھر ادھر چہکتے پھرنے والے بچے پریشانی کے عالم میں گھروں میں نظر بند تھے۔

گزشتہ پندرہ دنوں سے عدیل اسکول نہیں گیا تھا۔ وہ اپنے عزیز ترین دوست طاہر کے متعلق سخت پریشان تھا۔ کیونکہ طاہر جس علاقے میں رہتا تھا۔ اس مرتبہ کے ہنگاموں میں سب سے زیادہ تباہی وہیں مچی تھی۔ عدیل چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے طاہر کی خیریت معلوم ہوجائے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر دروازے تک جاتا اور واپس آجاتا فون اٹھاتا پھر رکھ دیتا، کیونکہ طاہر کے گھر فون نہیں تھا۔ اس کا پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ سارے گھر میں پریشان پریشان پھرتا رہتا۔ کبھی چھوٹے بھائی سے اُلجھ پڑتا۔ کبھی امی جان سے پوچھتا، امی لوگ کیوں لڑائی کرتے ہیں؟ وہ ایک دوسرے کا گھر کیوں جلا دیتے ہیں؟ ”امی..... کیا لڑائی کرنے والوں کے بچے نہیں ہوتے؟ ان کا گھر نہیں ہوتا؟“ بے شمار سوالات کرنے کے بعد وہ خود ہی کہتا۔ ”امی یہاں سے چلیں۔ ایسی جگہ چلیں جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگتا۔ اور امی جان پریشان ہو جاتیں۔

بہت دن گزر گئے مگر اسے اپنے دوست طاہر کی خیریت کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اخبارات زخمیوں کی تصاویر سے بھرے پڑے تھے۔ وہ تمام زخمیوں کو غور سے دیکھتا اور کسی تصویر پر جھک کر کہتا "یہ طاہر تو نہیں ہے لیکن بالکل اسی کے جیسا ہے۔ نہ جانے کس کا دوست ہوگا؟"

جب کرفیو میں وقفہ دیا گیا تو عدیل کے ابو ضروری سامان لینے کے لئے باہر نکلے تو عدیل کو بھی باہر نکلنے کا موقع ملا وہ سائیکل لے کر انتہائی تیز رفتاری سے طاہر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ مگر وہاں اور ہی منظر تھا۔ خوبصورت چھوٹے چھوٹے گھروں کی جگہ ان کا ملبہ پڑا ہوا تھا۔ جلا ہوا سامان بکھرا پڑا تھا۔ اور چند افراد اپنے گھر کے ملبے پر بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ عدیل اس منظر کو چند لمحے تک حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر وہاں موجود لوگوں سے طاہر کا پتہ معلوم کرنے لگا۔ عدیل، طاہر کے مکان کے جلے ہوئے حصے میں داخل ہوا اور اسے آواز دینے لگا۔ "طاہر تم کہاں چھپے ہو، جلدی سے نکل آؤ، دیکھو۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ ایسے طاہر کو آوازیں دے رہا تھا۔ جیسے کہ طاہر ابھی ابھی کسی دیوار کے پیچھے سے نکل آئیگا۔ ایک سپاہی نے عدیل کو ملبے کے قریب جانے سے روک دیا تو عدیل نے اس سے پوچھا، "پولیس انکل! آپ نے میرے دوست طاہر کو دیکھا ہے۔" تو پولیس نے اس کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بیٹے۔ !یہاں تو بہت سے طاہر کھو گئے ہیں۔"

"میرا دوست طاہر مجھ سے چھوٹا تھا۔ اس کا کتا جمی بھی ساتھ رہتا تھا۔ وہ سب کہاں گئے؟" عدیل نے پولیس والے کو تفصیل سے بتایا تو وہ بولا، بیٹے آپ گھر جاؤ تمہارا دوست مل جائیگا۔"

"نہیں، نہیں، اسے میں خود ڈھونڈوں گا۔ آج بہت دن ہوگئے وہ میرے گھر نہیں آیا بہت دنوں سے ہم نے مل کر ہوم ورک بھی نہیں کیا۔" یہ سب کہتے ہوئے عدیل کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں اتنے میں اس کے ابّو آتے نظر آئے جو اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے۔ ابّو عدیل کو لے جانے لگے تو وہ مچل گیا نہیں میں طاہر کو لے کر جاؤں گا اس کا گھر جل گیا ہے اب وہ کہاں رہے گا؟"

کرفیو کا وقفہ ختم ہونے والا تھا مگر عدیل تو گھر آنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ ابو اسے زبردستی پکڑ کر لے آئے۔ اور اسے اس کے کمرے میں مقیّد کر دیا۔ وہ چیختا، چلّاتا دروازہ پیٹتا رہا۔ اور کافی دیر تک رونے کے بعد سو گیا۔ تو اس کے ابو امی نے فیصلہ کیا کہ اسے طاہر اور اسے کے گھر والوں کی موت سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ جب عدیل سو کر اٹھا تو اس کی امی نے اسے طاہر اور اس کے گھر والوں کے جل کر

مرنے کی اندوہناک خبر سنادی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ مگر پھر اسے یقین کرنا پڑا کیونکہ اس کا ننھا سا دل ایسی ہی کسی روح فرسا خبر کے اندیشے سے پہلے ہی گھبرا رہا تھا۔ طاہر کی موت نے عدیل پر بہت گہرا اثر ڈالا شدّت غم سے اس کا دل بجھ گیا تھا جلد ہی محلے کے تمام بچوں میں طاہر کے موت کی خبر پھیل گئی۔ اور وہ سب اظہار افسوس کے لئے عدیل کے گھر آنے لگے۔ جب طاہر عدیل کے گھر آتا تھا تو محلے کے دیگر بچوں سے بھی اس کی ملاقات ہوتی تھی اور اسی وجہ سے تمام بچے اس سے واقف تھے اور اسے اپنا دوست سمجھتے تھے۔

سارے بچے اداس بیٹھے تھے۔ ایک بچے نے خاموشی کو توڑتے ہئے کہا۔ "کتنے گندے لوگ ہیں اتنے چھوٹے بچوں کو مار دیتے ہیں۔"

دوسری بچّی بولی، "پتہ نہیں میرے پاپا کہہ رہے تھے بہت ظالم لوگ ہیں سب کو مار دیتے ہیں اس لئے اب ہم لوگ پاکستان سے باہر چلے جائیں گے۔"

"تم سب بھی اپنے پاپا سے کہو نا کہ وہ بھی باہر چلے جائیں ورنہ وہ لوگ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔" ٹونی نے مشورہ دیا۔

"نہیں نہیں..... ہم لوگ اپنا وطن نہیں چھوڑینگے۔" عدیل جلدی سے بول اٹھا۔

"سنو ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ "کیوں نہ ہم سب مل کر ان لڑائی کرنے والوں کے بچوں کے پاس چلیں اور انہیں کہیں کہ وہ اپنے بڑوں سے کہیں کہ وہ ہنگامہ نہ کیا کریں۔ کسی کو نہ مارا کریں۔"

"اچھا مگر ہمیں کیا پتہ کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں۔" ایک بچے نے پوچھا۔

دوسرا بولا۔ "ہاں یہ تو ہے" دوستوں! ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ روز روز کے ہنگاموں سے ہمیں بہت نقصان ہو رہا ہے۔ اسکول بھی بند ہے۔ پڑھائی نہیں ہوتی ہم باہر کرکٹ بھی نہیں کھیل سکتے۔ روز کرفیو ہوتا ہے ہم تو قید ہوگئے ہیں۔" یہ بابر بول رہا تھا۔ جو تمام بچوں میں سب سے بڑا تھا اور آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ سب بابر کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے اسکول کا بہت اچھا مقرر تھا۔ اسے تقریری مقابلے میں بے شمار انعامات ملے تھے۔ بابر آہستہ آہستہ سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "بھئی سنو۔ ! جو لوگ لڑتے ہیں انکے بھی بچے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم سارے شہر کے بچے آپس میں دوستی کر لیتے ہیں۔ اور متحد ہو جاتے ہیں پھر ہم سب یہ کہیں گے کہ "ہمیں زندہ

رہنے دو اور پڑھنے دو تاکہ ہم بڑے ہو کر اپنے ملک کی خدمت کر سکیں۔ اگر ہمارے بڑے جو آپس میں لڑتے ہیں دوستی نہیں کریں گے تو پھر ہم سب بچے مل کر کسی دریا میں چھلانگ لگا دیں گے تاکہ جنہیں لڑنا ہے وہ آرام سے لڑیں۔ پھر نہ ہمارا کوئی دوست مرے گا نہ اسکول بند ہوں گے نہ ہی ہمارا کوئی دوسرا نقصان ہو گا۔"

بابر کی باتوں کو سب نے دلچسپی اور توجہ سے سنا اور ایک زبان ہو کر بولے۔ "ہاں ٹھیک ہے" عدیل بولا۔ "اور کیا دوستو! روز بچے گولی سے مر جاتے ہیں۔ اس سے اچھا ہے کہ سب ایک مرتبہ ہی مر جائیں۔ ان لڑنے والوں کو ہم بچوں سے کوئی محبت نہیں ہے۔ خود تو اپنی زندگی گزار چکے ہیں اور ہمیں جینے نہیں دیتے۔"

"اب تم اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنے دوستوں کو ساری باتیں بتاؤ جو ہم نے ابھی آپس میں کی ہیں۔ اور سب کو یہ بھی بتا دو کہ وہ جتنے بچوں کو جانتے ہیں سب تک یہ باتیں پہنچا دیں۔ سارے شہر کے بچوں کو اکٹھا کر لو۔ کوئی الگ نہ رہنے پائے۔" بابر نے کہا۔ تو ننھی نگہت غصے سے سرخ ہوتی ہوئی بولی۔ "جو بچہ ہمارے ساتھ نہیں آئے گا۔ وہ بچہ نہیں ہو گا وہ بھوت ہو گا۔ چڑیل ہو گی۔" نگہت کی بات سن کر سب ہنسنے لگے اور ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔

جلد ہی بچوں نے اپنا اپنا کام نپٹا لیا اور ایک مخصوص دن کرفیو کے وقفے کے دوران وہ سب عدیل کے گھر پر اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے طاہر کی مغفرت کے دعا کی اور پھر انکے درمیان سے بابر اٹھا اس نے تقریر کی۔ یہی منظر شہر کے اور دوسرے علاقوں کے گھروں میں بھی تھا۔ جہاں بچے اپنے مختلف دوستوں کے گھر پر جمع تھے، اور آئے دن کے ہنگاموں سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔

پھر ایک دن جیسے ہی کرفیو میں وقفہ ہوا شہر کی تمام بستیوں سے بچوں کا ایک ایک گروہ بر آمد ہوا وہ سڑک پر جمع تھے۔ ان میں زندگی کی ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے بچے موجود تھے۔ جو مسلسل ہنگاموں اور کرفیو سے تنگ آ کر سڑکوں پر جمع تھے۔ ان میں ایک بچہ با آواز بلند کہہ رہا تھا۔ "دوستو! ہم اس زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہمارے بڑے آپس میں لڑتے ہیں اور ہم دوستوں کو بھی ملنے سے منع کرتے ہیں کہتے ہیں۔ اس سے مت دوستی کرو۔ وہ پنجابی ہے، وہ پٹھان، وہ سندھی ہے، وہ مہاجر ہے تو وہ بلوچی ہے۔ دوستو! انہیں نہیں معلوم کہ سب صرف بچے ہیں۔ پنجابی، پٹھان، مہاجر بلوچی

سندھی نہیں۔ روز ہمارا کوئی نہ کوئی ساتھی مرجاتا ہے۔ کسی کا گھر جلا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم سب اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں۔ جو گھر تمہیں کل جلانا ہے آج ہی جلا دو۔ ہمیں ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ لہٰذا ہم سب آج ہی مل کر مرنے جارہے ہیں اس لئے کہ کسی کو ہم سے محبت نہیں ہے۔ کسی کو ہماری کتابوں سے محبت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم سب مرجائیں گے پھر آپس میں آپ سب جی بھر کر لڑتے رہنا۔ آپ لوگوں کی لڑائی سے پریشان ہونے والا کوئی بچہ اس شہر میں نہیں بچے گا۔ ہم نے آج سے پہلے اپنی اہمیت اور موجودگی کا احساس دلانے کے لئے اور ہنگاموں سے بیزاری کے اظہار کے لئے امن مارچ کیا تھا۔ جس کا ہمارے بڑوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کسی نے ہمارے تحفظ کی ضمانت نہیں دی۔ اب جب ہم ڈوبنے لگیں گے تو ہمیں کوئی بچانے نہیں آئے گا۔ کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ ہم خوش رہیں اس لئے ہم مرجانا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ سب ایک سمت تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ بہت سے بچوں کو ان کے والدین پکڑ پکڑ کر گھر لے جارہے تھے مگر وہ واپس آکر اپنے دوستوں میں مل گئے۔ شہر کے مختلف حصوں سے نکل نکل کر بچوں کا ہجوم کلفٹن کے ساحل پر جمع ہوچکا تھا۔ والدین اپنے بچوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کرفیو کا وقفہ ختم ہوچکا تھا مگر تمام شہر کے افراد گھروں سے باہر تھے۔ وہ سب حیرت واستعجاب کے عالم میں بچوں کے جم غفیر کو دیکھ رہے تھے۔ جو شہر کے ہنگاموں سے تنگ آچکا تھا اور اب اجتماعی موت مرنے جارہا تھا۔

والدین اپنے بچوں کو پکڑ پکڑ کر گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے۔ مگر بچے نکل نکل کر بھاگتے اور ہجوم میں گم ہوجاتے۔ مائیں چیخ رہی تھیں اور ان کے باپ منہ کھولے کھڑے تھے۔ اعلیٰ حکام اخباری نامہ نگاروں اور کیمرہ مینوں سمیت موجود تھے۔ والدین نے جب بچوں کے اٹل ارادے کو محسوس کیا تو ان کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔ جو آپس میں لڑے ہوئے تھے۔ گلے ملنے لگے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ بچوں سے کہو کہ ہماری دوستی ہوگئی ہے اب ہم کبھی نہیں لڑیں گے۔" مگر بچے اب کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ اچانک بابر کی آواز گونجی تو مجمع پر سکوت طاری ہوگیا۔ عدیل بولا، "آج سے پہلے جب لوگ کلفٹن کے ساحل پر آتے تھے تو خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر آج کے بعد لوگ یہاں آکر آنسو بہائیں گے۔ کیونکہ ہم سب مرنے جارہے ہیں۔ آؤ دوستو! امن، محبت اور بھائی چارہ کی خاطر سمندر میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ دیکھو! سمندر ہمارا انتظار کر رہا ہے لہریں ہمیں بلا رہی ہیں۔ یہ کہہ کر بابر نے

سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اس کے ساتھ ساتھ چار پانچ اور دوسرے بچوں اور بچیوں نے بھی سمندر میں چھلانگ لگادی۔ ڈوبنے والے بچوں کے والدین جو سندھی، پنجابی، پٹھان، مہاجر و بلوچی تھے۔ اور کبھی ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے گلے مل کر رونے لگے۔ "اب رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ سب ڈرامہ پہلے بھی ہوچکا ہے۔ ہمیں مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" یہ کہہ کر عدیل نے بھی بڑھتی ہوئی لہروں میں چھلانگ لگادی۔ مگر اچانک اس کی امی نے اسے دبوچ لیا۔ وہ چیخنے لگا "چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔ مرنے دو میرے دوست ڈوب چکے ہیں۔ مجھے بھی ڈوبنا ہے۔ چھوڑو مجھے جانے دو۔ مجھے اب کوئی نہیں روک سکتا۔" اس کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ اب تک چیخ رہا تھا۔ اس کے والدین اس کے سرہانے کھڑے تھے۔ اس کی امّی نے پوچھا۔ "کوئی خواب دیکھا ہے تم نے بیٹے؟" چند لمحے عدیل کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

خواب نہیں! حقیقت "اب یہی ہوگا۔ یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ پھر ایک نئی دنیا آباد ہوگی۔ جہاں امن، محبت، دوستی، بھائی چارہ کی حکمرانی ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ تاکہ تمام شہروں کے بچوں کو اکٹھا کر سکے۔

باجی

وحید ظفر

باجی میری ڈھیلی ڈھالی
بال ہیں لمبے آنکھیں کالی
بنتی ہیں یہ بھولی بھالی
پر ہیں آفت کی پر کالی
کام ہزاروں جانتی ہیں یہ
پر ہیں شیخی مارنے والی
پرس میں ان کے مال بہت ہے
لیکن ہیں کنجوس مثالی
گاڑی پر یوں اتراتی ہیں
جیسے ہوں وہ راکٹ والی

باسکرویل کا شکاری کتّا

سر آرتھر کونن ڈویل
ترجمہ ۔ شاہنواز فاروقی

میرے دوست شرلاک ہومز کی پوری زندگی بے شمار عجیب وغریب قسم کے جاسوسی کیسوں کو سلجھاتے گزری ہے مگر جو کیس میں آپ کو اب سنانے جارہا ہوں ایسے کسی کیس سے ہومز کو کبھی واسطہ نہیں پڑا۔

یہ واقعہ عام سے انداز میں ہومز کے لندن کی بیکر اسٹریٹ پر واقع فلیٹ سے شروع ہوا۔ یہ ۱۸۹۰ کے ستمبر کے آخری دنوں کی بات ہے۔ اس روز ہومز اپنے ہاتھ میں پیلے رنگ کی ایک دستاویز لئے ہوئے تھا۔ دستاویز کا اڑا ہوا رنگ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ خاصی پرانی ہے۔ دستاویز پر "باسکر ول ہال" لکھا تھا۔ ہومز نے مجھے بتایا کہ جیمز مور ٹائمر نام کا کوئی شخص اس دستاویز کو ہومز کے مطالعہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔

"جیمز بھی تمہاری طرح ڈاکٹر ہے واٹسن" شرلاک ہومز نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ آج شام مجھے سے ملاقات کر رہا ہے۔" دستاویز کے مطالعہ سے ہومز کو معلوم ہو چکا تھا کہ باسکر ول کا خاندان کس عذاب سے گزرا ہے۔ اور اس عذاب کا آغاز کس طرح ہوا.....

اپنے آغاز سے لے کر اب تک باسکر ول خاندان پر نازل ہونے والا یہ عذاب باپ سے بیٹے کو منتقل ہو رہا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے لوگ نہایت پراسرار انداز میں ہلاک ہو چکے تھے۔ اور وہ لوگ جو ابھی اس خاندان میں پیدا ہونے تھے ان کے لئے دستاویز میں ہدایت درج تھی کہ وہ رات کی

تاریکی میں ناہموار اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی جگہ کے پاس اس وقت اکیلے نہ گزریں جب شیطان صفت شکاری کتا وہاں موجود ہو۔ دستاویز اتنی بات بیان کر کے ختم ہو جاتی تھی۔

شام کو جب ڈاکٹر جیمز مورٹائمر ہومز سے ملنے کے لئے آیا تو ہومز نے وہ دستاویز اسے واپس کر دی۔ اس نے مورٹائمر سے کہا کہ وہ اس دستاویز میں بیان ہوئے والی جادوئی قسم کی کہانی پر اعتبار نہیں کرتا۔

"صبر کیجئے مسٹر ہومز" مورٹائمر نے ہومز کا تبصرہ سن کر کہا۔ پھر وہ بولا۔

"یہ ایک طرح سے اچھا ہوا کہ آپ نے اس دستاویز کا مطالعہ کر لیا۔ کیونکہ میں اب آپ کو اپنے ایک عزیز دوست اور باسکر ول خاندان کے تین ماہ قبل ہلاک ہونے والے شخص سر چارلس کی موت کی تفصیلات سنانے جا رہا ہوں۔ چنانچہ ممکن ہے اس دستاویز کا مطالعہ آپ کے لئے کسی نتیجہ پر پہنچنے میں معاون ہو" مورٹائمر بولتا رہا۔

"موت سے کچھ دنوں پہلے سر چارلس کی عادتوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ شکاری کتے کا عذاب اب ان پر نازل ہونے والا ہے۔ انہوں نے رات کے وقت جھاڑ جھنگاڑ سے بھری ہوئی ناہموار جگہ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں نے کوئی عجیب و غریب جانور تو نہیں دیکھا یا کسی شکاری کتے کے بھونکنے کی آوازیں تو نہیں سنیں۔ مورٹائمر یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے رکا پھر یوں گویا ہوا۔

"کتے کے خوف نے ہی ان کے دل کے مرض کو شدید کر دیا تھا۔ انکے اعصاب پر ہر وقت خوف طاری رہتا تھا۔ اس زمانے میں ان کے اندر بعض عجیب و غریب عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ ہر رات باسکر ول کے ہال سے بجری کے راستے پر چلتے ہوئے جھاڑیوں سے بھری ناہموار جگہ کے دروازے تک ضرور جاتے تھے۔ مگر انہوں نے اس دروازے سے آگے جانے کی کبھی ہمت نہ کی۔"

"جون کی ایک رات کو ان کے خانساماں بیری مور نے مسٹر چارلس کو جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ناہموار جگہ کے دروازے کے پاس مردہ پایا۔ بجری کے راستے پر دو افراد کے پیروں کے نشانات تھے۔ مسٹر چارلس کے اور بیری مور کے۔ چارلس جس جگہ گر کر ہلاک ہوئے تھے اس سے ذرا پہلے ایسے نشانات موجود تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ مسٹر چارلس نے پنجوں کے بل چلنا شروع کر دیا

تھا۔"

اطلاع ملتے ہی میں موقعۂ واردات پر پہنچا اور میں نے مسٹر چارلس کی لاش کا معائنہ کیا۔ ان کے جسم پر کسی قسم کے تشدد کا نشان نہ تھا لیکن ان کا چہرہ خوف کے مارے مسخ ہو گیا تھا۔ ان کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی تھی۔ ان کے خانساماں بیری مور نے مجھے اسی وقت بتایا تھا کہ لاش کے ارد گرد کسی قسم کے نشانات موجود نہیں تھے۔ مگر جب تھوڑی دیر بعد میں ٹہلتا ہوا لاش سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر گیا تھا تو مجھے یہ نشانات نظر آئے۔ تاہم تھوڑی ہی دیر بعد تیز بارش شروع ہو گئی اور یہ نشانات مٹ گئے۔" یہ کہہ کر مور ٹائمر رک گیا۔

شرلاک ہومز نے گہری دلچسپی کے ساتھ مور ٹائمر کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ پیروں کے نشانات تھے؟" ہومز نے پوچھا۔

"ہاں"

"کسی مرد کے یا عورت کے؟"

ڈاکٹر مور ٹائمر نے نہایت تجسّس کے ساتھ ہم دونوں کی جانب دیکھا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"مسٹر ہومز وہ ایک عظیم الجثہ شکاری کتّے کے پیروں کے نشانات تھے۔"

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

ہومز نے مور ٹائمر کی طرف دیکھا اور پوچھا "آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟"

"آپ سے مشورہ لینے۔ اب سے ایک گھنٹہ بعد سر ہینری باسکر ول کینیڈا سے لندن پہنچ رہے ہیں۔ مسٹر ہینری سر چارلس کے چھوٹے بھائی کے بیٹے اور باسکر ول خاندان کے آخری فرد ہیں۔" مور ٹائمر نے ایک طویل سانس لیا اور پھر بتایا۔

"اب سے تین برس قبل تک باسکر ول خاندان کا ایک اور فرد زندہ تھا۔ اس کا نام روجر تھا۔ وہ برازیل میں مقیم تھا۔ روجر گردن توڑ بخار سے ہلاک ہوا تھا۔ روجر اس افسانے کے ایک کردار مسٹر ہیوگو کی نسل سے تھا۔"

"آپ کے خیال میں باسکر ول خاندان کے کسی فرد کی رہائش کے لئے ڈاٹ مور کیسی جگہ ہے۔" مور ٹائمر نے ہومز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ہومز نے فوراً کوئی جواب نہ دیا تو اس نے

بات کو آگے بڑھایا۔ "اصل میں ہم چاہتے ہیں کہ سر ہینری ہمارے ساتھ رہیں اور اس کام کی مناسب دیکھ بھال کریں جو سر چارلس نے ضلع کے غریبوں کے لئے شروع کر رکھا ہے۔"

"میرا مشورہ ہے یہ ہے کہ آپ سر ہینری سے ملیئے اور انہیں سہ پہر میرے پاس لے آیئے۔" "ہاں ایک سوال اور" سر ہینری نے رکتے ہوئے کہا "سر چارلس کی موت سے قبل بہت سے لوگوں نے شکاری کتے کو ناہموار جگہ پر دیکھا ہے کیا مسٹر چارلس کے مرنے کے بعد بھی کسی نے اس کتے کو دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب" ڈاکٹر مور ٹائمر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر مور ٹائمر کے جانے کے بعد میں نے ہومز سے پوچھا۔

"مرنے سے پہلے سر چارلس پنجوں بل کیوں چل رہا تھا؟"

"احمقانہ باتیں مت کرو واٹسن۔ وہ اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا۔"

"مگر کس سے بچانے کے لئے؟" میں جھنجھلاتے ہوئے پوچھا"

"یہی گتھی تو سلجھانی ہے" ہومز نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہم سر ہینری کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ سہ پہر کو ڈاکٹر مور ٹائمر سر ہینری باسکرول کے ساتھ آپہنچے۔ سر ہینری گھٹے ہوئے جسم کا تیس برس کے آس پاس عمر رکھنے والا خوشگوار شخصیت کا مالک تھا۔

سر ہینری نے ڈاکٹر مور ٹائمر کی زبانی باسکر ول خاندان پر ٹوٹنے والی تمام مصیبتوں کو بڑے غور سے سنا۔ پھر اس نے نہایت مدہم مگر پر عزم لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ باسکر ول کے خاندانی گھر میں کوئی بلا نہیں رہتی۔ میں یہ کہانی سننے کے باوجود اسی جگہ پر ٹھہروں گا۔"

"بہت خوب۔ گویا یہ معاملہ تو طے ہو گیا" ہومز نے کہا۔

"مگر ڈاکٹر واٹسن آپ کے ساتھ اسی گھر میں ٹھہریں گے۔"

اگلے روز سر ہینری ڈاکٹر مور ٹائمر اور میں ٹرین کے ذریعہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہومز کو اپنے ایک اہم کیس کے سلسلہ میں چند روز لندن میں قیام کرنا تھا۔ سفر بڑا پر لطف رہا۔ سفر کے دوران ڈاکٹر مور ٹائمر اور سر ہینری کے ساتھ میری جو گفتگو ہوئی اس نے مجھے ان دونوں کا گرویدہ بنا

دیا۔

بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اسٹیشن کے باہر دو گھوڑوں والی گھوڑا گاڑی ہماری منتظر تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر باسکر ول کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوگئے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ سورج ناہموار زمین کے ٹیلوں کے عقب میں غروب ہو رہا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی بنجر اور ناہموار زمین کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ تیزی سے پھیلے ہوئے اندھیرے اور سرد ہوا نے ہمیں خاموش کر دیا تھا۔ ہمارے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، جنگلی گھاس اور ایک کے دوسرے ساتھ الجھے ہوئے درخت تھے۔

اچانک گاڑی بان نے اپنی چھڑی کے ذریعہ ایک طرف کو اشارہ کیا اور بولا "باسکر ول کی کوٹھی" چند لمحوں بعد ہم کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ ہم درختوں سے گھرے ہوئے۔ ایک راستے کے ذریعہ کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے۔

کوٹھی کے خانساماں بیری مور نے کوٹھی کے پورچ میں ہمارا استقبال کیا۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر مور ٹائمر گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ باسکر ول کی کوٹھی تاریک اور آسیب زدہ سی تھی۔ میری طرح سر ہینری نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے بستروں پر چلے گئے۔ اپنے سونے کے کمرے کی کھڑکی سے جب میں نے باہر ناہموار ٹیلوں کی طرف دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ باہر روح کو دھلا دینے والا سناٹا تھا۔ میرے کمرے میں بھی قبرستان کا سا سناٹا چھایا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک بستر پر لیٹا جاگتا رہا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند نے آدبوچا۔

اگلی صبح سر ہینری اور میں ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے تو بڑے ہشاش بشاش تھے۔ ناشتہ کے بعد سر ہینری کسی کام سے باہر چلے گئے۔ چنانچہ میں اس ناہموار علاقہ کے کنارے کنارے گھومنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی میں دو تین میل ہی چلا ہوں گا کہ کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو میں چالیس برس کے درمیان کی عمر کا ایک شخص میری جانب چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی سے بندھا ہوا تتلیاں پکڑنے والا ایک جھوٹا سا جال اور تتلیاں بند کرنے کے لئے ایک ٹین کا چھوٹا سا بکس تھا۔

اس نے اپنا نام جیک اسٹیپلٹن بتایا۔ ڈاکٹر مور ٹائمر نے جو کہ اس کے دوست تھے اسے

میرے بارے میں بتایا تھا۔ جیک نے مجھے گفتگو کے دروان بتایا کہ اسے یہ علاقہ بہت پسند ہے اور وہ ایک زمانے میں یہاں دو برس تک رہ چکا ہے۔

جیک اسٹیپلٹن کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ یکایک ایک حیوانی چیخ فضاء میں بلند ہوئی۔ خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مگر جیک اسٹیپلٹن کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

"لگتا ہے کوئی جنگلی ٹٹو دلدل میں پھنس گیا ہے۔" جیک نے میری جانب دیکھ کر سکون کے ساتھ کہا۔ میری نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلہ پر ایک ٹٹو دلدل میں اترتا چلا جارہا تھا۔ ابھی اس کی گردن دلدل سے باہر تھی۔ تاہم چند لمحوں بعد دلدل ٹٹو کو نگل گئی۔

"یہاں خاصی دلدل ہے۔ اس لئے یہ علاقہ خاصا خطرناک ہے۔"

جیک نے کہا۔ "میں اس علاقہ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے مطلب کی تتلیاں کہاں ہوتی ہیں۔ مگر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ ذرا محتاط رہئے گا۔" جیک نے اپنی بات مکمل کی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ تبھی دو پہاڑی کوّے ہمارے عقب میں موجود پہاڑی پر سے اڑے۔ اسی لمحہ کسی جانور کے رونے کی ایک طویل آواز فضاء میں گونج کر ختم ہوگئی۔

"میرے خدا یہ کس کی آواز تھی؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسٹیپلٹن سے پوچھا۔

"لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ آواز باسکرول کے شکاری کتے کی ہے جو اپنے شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہے مگر اتنی زوردار نہیں جتنی کہ یہ آج تھی۔" جیک نے عجیب وغریب تاثر کے ساتھ میری جانب دیکھ کر کہا۔

میں نے خوف زدہ ہو کر جیک کی طرف دیکھا۔ جیک کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ چند لمحوں بعد وہ یہ کہہ کر کہ اسے سر ہینری سے ملنا ہے اس فارم کی جانب روانہ ہوگیا جہاں وہ آج کل ٹھہرا ہوا تھا۔

ٹٹو کی موت اور شکاری کتے کی آواز سے ملتی جلتی پراسرار آواز نے میرے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ میں کئی طرح کے خطرات کو ذہن میں لئے باسکرول کوٹھی میں لوٹ آیا۔

اگلے روز جیک اسٹیپلٹن سرہینری سے ملنے آیا۔ وہ ہم دونوں کو لے کر ناہموار جھاڑیوں ذرہ زمین کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں مقامی لوگوں کے بیان کے مطابق اس پراسرار کہانی کے ایک کردار ہیوگو کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب طرح کی اداسی سے بھری جگہ تھی۔

اس دوران جیک اسٹیپلٹن نے سرہینری کے ساتھ نہایت دوستانہ رویہ کا مظاہرہ کیا۔

اگلے روز سرہینری اور میں گھومتے ہوئے قریب واقع قصبہ گرم پن کی طرف جانکلے۔ ڈاکٹر مور ٹائمر اسی قصبہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے کچھ دیر ان کے گھر میں آرام کیا۔ شام ڈھلنے سے ذرا پہلے ہم دونوں باسکرول کی کوٹھی کی طرف چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا پھیلنے لگا۔ اندھیرے کو پھیلتے دیکھ کر سرہینری نے مزاقیہ لہجے میں کہا۔

"دستاویز میں باسکرول کے ہر زندہ شخص کو ہدایت کی گئی ہے کہ رات کو ناہموار زمین کے قریب سے نہ گزرے" ابھی سرہینری نے اپنا جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ فضا میں وہی خوفناک آواز گونج اٹھی جو میں نے اسٹیپلٹن کے ساتھ سنی تھی۔

(جاری ہے)

ڈاڑیل

آخری قسط

نعیم بلوچ

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے۔۔۔ وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نامعلوم جگہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں انھیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد انھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکوؤں نے بس کے تمام مسافروں کا اسباب لوٹ لیا اور ایک بوڑھے ہاری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جانو کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔ دوسری طرف رام چند نے ارد گرد کے علاقے میں میں رہنے والوں کو دعوت پر بلایا اور ملک کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو حکمران بھی آتا ہے وہ سندھیوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد رام چند۔ زندہ باد اور "سندھو دیش۔ زندہ باد" کے نعرے بھی لگے۔ دعوت کے بعد رام چند سردار قادر خان کو ایک خفیہ کمرے میں لے گیا جہاں بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ رام چند نے قادر خان کو کہا کہ وہ ہر اس آدمی کو اغوا کر لے یا گولی مار دے جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے بارے میں کچھ بتائے۔ پھر اس نے قادر خان کو کہا وہ مشہور پاکستان دوست لیڈر عبدالحق کو ہر قیمت پر اغواء کر لے۔ ادھر جانو کی ماں کو جب علم ہوا کہ اس بیٹا ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو چکا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ دوسری طرف ایک روز رات کے وقت عبدالق اپنی کار میں گھر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صحافی بھی تھا۔ جوان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ شیراڈ نے ان کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ ڈرائیور اور صحافی کو بے ہوش کر کے عبدالحق کو بھی بے ہوش کر کے شیراڈ میں بٹھا لیا گیا۔ اور اسے ڈاکو قادر خان کے ٹھکانے پر لے گئے۔ ۲۵ تاریخ کو رام چند نے اخبار میں عبدالحق کے اغواء کی خبر پڑھی اور وائرلیس

پر کسی کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ چند روز بعد قادر خان کی جیپ عبدالحق۔ جانو اور رام چند کے ایک آدمی کو لے کر کسی اجنبی مقام کی طرف جارہی تھی۔ عبدالحق جانو کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب ان کی جیپ اپنی منزل پر پہنچی تو عبدالحق جانو کو پہچان چکا تھا۔ جانو کو معلوم ہو گیا کہ عبدالحق اس کے باپ کو جانتا ہے۔ اس نے عبدالحق کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز ڈاکو قادر خان کے آدمیوں نے گاؤں میں زبردست فائرنگ کی اور مختلف مکانات کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل بھاگے۔ اگلے دن وہ اپنی بہنوں سے ملنے گیا اور ان کے سامنے عہد کیا کہ وہ ڈاکو نہیں بنے گا۔ اس نے انہیں انتظار کرتے کو کہا تاکہ وہ لوگ گاؤں چھوڑ کر کسی اور جگہ جا سکیں۔ پھر وہ اس حویلی میں جا پہنچا جہاں عبدالحق کو قید میں رکھا گیا تھا۔ اندھیرے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس سے کافی آواز پیدا ہوئی۔ اتنے میں کسی نے جانو کو للکارا۔

جانو جانی پہچانی آواز کو سن کر گھستا ہوا اس کمرے کے پاس پہنچا جس میں، رام چند اور اس کے ساتھی، عبدالحق اور دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے اغوا اور قتل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک جانو کو پیچھے سے ایک شخص نے پکارا۔ یہ منظور تھا۔ منظور کے ذریعے جانو عبدالحق کے تہہ خانے تک پہنچا اور پھر عبدالحق کو لے کر فرار ہو گیا مگر فرار ہوتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ لیا گیا۔ اور کچھ لوگ ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ جانو نے حویلی سے بہت دور ستائے ہوئے عبدالحق سے اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں پوچھا مگر عبدالحق نے کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر جانو کے بہن بھائی گھر پر اس کے منتظر تھے۔ اتنے میں رام چند ان کے گھر پہنچا۔ تو اسے اس کی بیوی نے بتایا کہ جانو نے گھر آکر اس سے بدتمیزی کی ہے۔ رام چند اپنے کمرے میں تھا کہ جانو آکر اپنے بہن بھائیوں کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ رام چند نے تھوڑی دیر بعد جانو کے بہن بھائیوں کو ان کے کمرے میں نہ پایا تو اس نے اپنے آدمیوں کو والی ملکی پر ان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ جانو اپنے بہن بھائیوں کو گندم کے ایک کھیت میں چھپا کر ان کے لئے پانی لینے گیا۔ واپس آیا تو اس کے بھائی بہن وہاں موجود نہ تھے۔ اتنے میں اسے ایک مانوس آواز نے پکارا جانو نے گھوم کر آواز کی طرف دیکھا۔

وہ عبدالحق تھا۔ جانو نے اسے اپنے بہن بھائیوں کے غائب ہونے کے بارے بتایا۔ عبدالحق نے ادھر ادھر دیکھا تو پایا کہ آس پاس کی زمین پر بچوں کے علاوہ ایک بڑے شخص کے پاؤں کے نشانات موجود تھے جو ایک پاس ہی کے گاؤں کی طرف جاتے تھے۔ اپنی خواہش کے برعکس جانو اپنے بھائی بہنوں کو تلاش کرنے کے بجائے عبدالحق کے ساتھ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ادھر رام چند نے وڈیرے رسول بخش کو ساری صورت حال بتائی۔ وڈیرہ گھبرا گیا اور رام چند کے اس مشورہ پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہے کہ عبدالحق اور جانو کو ہر صورت میں پولیس تک پہنچنے سے روکا جائے۔ ادھر عبدالحق اور جانو نصیر آباد کے تھانے جا پہنچے اور ساری صورت حال سے تھانے کے انچارج کو آگاہ کیا۔ ان دونوں کی خلاف توقع خوب خاطر مدارت کی گئی۔ اس وقت عبدالحق نے تھانے دار کو یاد دلایا کہ دس سال قبل اس نے وسایا کے قتل کا مقدمہ درج کیا تھا۔ اس ذکر پر تھانیدار اور جانو دونوں چونک پڑے۔ تبھی رام چند اور وڈیرہ رسول بخش وہاں آپہنچے اور دونوں کو وہاں موجود پا کر چونک پڑے اور پھر تھانیدار سے کہا کہ جانو کو تھانے سے نکال دے۔ مگر تھانیدار نے ایسا نہ کیا۔ اس پر وہ دونوں غصے سے باہر نکل کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ دوسری طرف جانو کے بہن بھائیوں کو ایک ہاری اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا تھا۔ اور اب گاؤں کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ان بچوں کی گمشدگی کا اعلان نشر ہو رہا تھا۔ جسے وہاں سے گذرتے ہوئے رام چند اور رسول بخش نے سن لیا۔ وہ دونوں چونکہ بااثر تھے اس انہوں نے مسجد کے پیش امام سے جانو کے بہن بھائیوں کو یہ کر اپنے ساتھ لے لیا کہ وہ ان کو ان کے بھائی تک پہنچا دیں گے۔ اسی وقت وہاں وہ دو سپاہی بھی پہنچے جو بچوں کو تلاش کر رہے تھے۔ رسول بخش نے انہیں دو سو روپے رشوت دی اور انہیں چلتا کیا۔ بچوں نے جب یہ سنا کہ ان کا بھائی حویلی میں ان کا انتظار کر رہا ہے تو وہ وڈیرے کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے۔

اب آپ آگے پڑھئے۔

بچّوں کے نہ ملنے پر جانو اور عبدالحق بہت پریشان تھے کہ اگر بچّے رام چند یا وڈیرے کے پاس پہنچ گئے تو وہ اُنہیں بلیک میل کریں گے۔ عبدالحق کئی دفعہ پولیس انسپکٹر سے کہہ چکا تھا کہ وہ اُسے پولیس جیپ کے ذریعے شہر پہنچا دے لیکن انسپکٹر اُسے یہ جواب دیتا کہ اگر قادر خان ڈاکو، وڈیرے اور رام چند کے واقعی ساتھ ملا ہے تو وہ یا تو راستے میں پولیس کی جیپ کو روک لے گا یا وہ کسی بھی وقت تھانے حملہ کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ نہ اُسے دو تین سپاہیوں کے ساتھ شہر بھیج سکتا ہے اور نہ تھانے سے اپنے سپاہیوں کو دُور کر کے اپنی قوت کم کرنا چاہتا ہے۔ عبدالحق کے پاس تھانیدار کی اس مضبوط دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ پولیس انسپکٹر نے عبدالحق کو یقین دلایا کہ وہ وڈیرے یا ڈاکوؤں سے ملا ہُوا نہیں ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ ڈاکو اور وڈیرے لوگ اتنے مضبوط ہیں کہ ان کے تعلّقات بڑے بڑے افسروں اور حکومت کے آدمیوں سے ہیں۔ اگر وہ اُن کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرے گا تو نوکری تو معمولی بات ہے، اس کی اور اُس کے گھر والوں کی جان بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ اس لئے اُنہیں مجبوراً سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند رکھنا پڑتی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ پولیس کے ایک سپاہی کو وڈیرے کی حویلی اور دوسرے کو رام چند کے اُس ٹھکانے کی طرف بھیج چکا ہے جہاں پر عبدالحق کو قید رکھا گیا ہے۔ انسپکٹر کے اتنے اچھے موڈ کو دیکھ کر جانو نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب! آپ وڈیرے اور رام چند کے آنے سے پہلے" وسایا" کے متعلق بتانے لگے تھے:"

"لیکن تم کیوں پوچھنا چاہتے ہو؟ کیا تم وسایا کے ..."

"ہاں میں اُسی وسایا کا بیٹا ہوں جس کو آپ نے ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ کر مار دیا تھا" جانو نے بھرّائی ہوئی آواز سے سارے ماحول کو ایک دم غمگین کر دیا۔

"نہیں بیٹے! تمہارے باپ کو ہم نے نہیں مارا۔ اُس نے تو صرف تھانے آ کر وڈیرے کی شکایت کی تھی کہ اگر وہ اپنے بیٹے کو اسکول سے نہیں ہٹائے گا۔ تو وہ اُس کی فصلوں کو جلا دے گا اور اُس سے اپنی زمین بھی چھین لے گا اور میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس تھانے پر میرا نہیں اُنہیں لوگوں کا حُکم چلتا ہے۔ چنانچہ جب وڈیرے کے پاس اس کی خبر پہنچی تو اُس نے وسایا کے متعلق پولیس کو بتایا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی ہے۔ پھر ایک دن ڈاکوؤں کے ساتھ پولیس مقابلہ ہُوا جس میں وسایا کے ساتھ ایک دوسرے ڈاکو کی لاش ملی حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ کسی ڈاکو کو ہماری گولی نہیں لگی۔"

"اور آپ نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ مشہور کر دیا کہ وسایا ڈاکوؤں کا ساتھی تھا۔ انسپکٹر صاحب! جب وسایا آپ کے پاس وڈیرے کی شکایت لے کر آیا تھا اُس وقت میں یہاں موجود تھا۔ اور میں کچھ دیر پہلے آپ سے اسی پہلی ملاقات کا پوچھ رہا تھا۔ جو آپ کو یاد نہیں آ رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب! میں آپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ چاہتے تو ذرا ہمّت کر کے سب کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن جب وڈیرہ آپ کی ہر ضرورت کو پورا کر دے تو آپ یہ کیوں نہیں

کہیں گے کہ وسایا کو وڈیرے کے کہنے پر قادر خاں نے نہیں بلکہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا... انسپکٹر صاحب..."

عبدالحق کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پولیس کا ایک سپاہی ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے سیلوٹ کیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سر، جانو کے بہن بھائی... وڈیرے کے پاس پہنچ گئے ہیں اور میں نے ڈاکو قادر خاں کے گروہ کے ایک ڈاکو کو بھی وڈیرے کے گھر جاتے دیکھا ہے۔"

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں دوسرا پولیس سپاہی بھی آگیا۔ اُس کو رام چند کی حویلی کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا اُوپر کا ہونٹ پھٹا ہُوا تھا۔ لگتا تھا کہ اُس کی پٹائی کی گئی ہے۔ اس نے بتایا۔

"سر حویلی کی نگرانی کے دوران... صبح آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اُس نے مجھ سے میرا پستول چھین لیا اور یہ کاغذ مجھے دے دیا اور پھر نہ جانے کہاں بھاگ گیا... یہ ہے وہ کاغذ"۔ اُس نے کاغذ میز پر رکھا۔ تھانیدار نے اونچی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

"اگر تینوں بچّوں کی زندگی عزیز ہے تو جانو اور عبدالحق کو فوراً اسی وقت وڈیرے رسول بخش کی حویلی بھیج دو۔ ایک گھنٹے تک اگر دونوں میں کوئی بھی ہمارے پاس نہ پہنچا تو ایک بچّے کی لاش آپ تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح اگلے دو گھنٹوں کے بعد باقی دو بچّوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور تھانیدار صاحب! اگلی بار تمہارے بیوی بچّوں کی ہوگی..."

عبدالحق نے جانو کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں شُعلے اُگل رہی تھیں۔ عبدالحق نے تھانیدار سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ آئی جی صاحب کو وائرلیس سے اس صورتِ حال سے خبردار کر دیں۔ یہ نہ ہو کہ شہر سے مدد آنے تک یہاں کھیل ختم ہوچکا ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ کہہ کر تھانیدار، آئی جی سے رابطہ کرنے وائرلیس والے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس سپاہی عبدالحق کو بھی وائرلیس والے ہی کمرے میں بُلا کر لے گیا۔

کمرے میں اب صرف ایک سپاہی کھڑا تھا۔ اُس نے بھی اپنی بندوق کھونٹی کے ساتھ لٹکائی اور پیشاب کرنے باہر چلا گیا۔ جانو اب اکیلا تھا وہ شاید اسی موقعے کی تلاش میں تھا۔ اُس نے بندوق اُٹھائی۔ ایک الماری میں چادر لٹک رہی تھی اُسے اُوپر لے لیا۔ بندوق چادر میں چھُپ گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا باہر کی طرف چل پڑا۔ دروازے میں ہی ہوگا کہ ایک اور پولیس والا اُسے سامنے سے آتا ہُوا مل گیا۔ اُس کے پوچھنے سے پہلے ہی جانو نے اُسے کہا..."میں رفع حاجت کے لئے جا رہا ہوں..." اور جواب سُنے بغیر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا باہر کی طرف چل پڑا۔

پانچ چھ منٹ کے بعد عبدالحق، تھانیدار کے ساتھ اس کمرے میں آیا۔ "جانو کہاں ہے؟" اُس نے آتے ہی سوال کیا۔

"وہ ضرورت کے لئے باہر گیا ہے" وہاں موجود سپاہی نے کہا۔ لیکن عبدالحق کی بے چینی میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد جانو جس سپاہی کی بندوق لے کر گیا تھا، وہ بھی آگیا۔ "تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟" تھانیدار نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا، سپاہی جانو کو وہاں موجود نہ پاکر اور تھانیدار کی اس ڈانٹ کو سُن کر خاصا بوکھلا گیا۔ اس کی نظر جب کھونٹی پر پڑی تو وہ معاملہ سمجھ گیا تھا۔ "سر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری رائفل وہ لڑکا لے بھاگے گا" تھانیدار اور عبدالحق ایک ساتھ اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"سر آپ گھبرائیں نہیں۔ وہی کچھ کریں جو آئی جی صاحب نے کہا ہے" تھانیدار نے عبدالحق کو کہا۔

جانو ایک چھکڑے پر سوار اپنی گوٹھ میں داخل ہوا۔ چھکڑے والا اس کے والد کا دوست تھا۔ وہ اُسے اُس کے پُرانے گھر اُتار کر چلا گیا۔ جانو اسی راستے وڈیرے کی حویلی کی طرف جا رہا تھا، جس راستے وہ اپنی بیمار ماں کے لئے چلچلاتی دُھوپ میں ننگے پاؤں وڈیرے کے منشی کے پاس ہاتھ پھیلانے گیا تھا۔ لیکن آج وہ اپنا سارا حساب چُکانے جا رہا تھا۔ اس دن وہ مجبور اور مظلوم کی آہ بن کر گیا تھا لیکن آج وہ انتقام کے شُعلے برسانے جا رہا تھا۔ اُس دن سوائے خدا کے اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ آج بہت ساری آنکھیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں، مگر وہ ان سب لوگوں کی پرواہ کئے بغیر چادر کے نیچے بندوق کو مضبوطی سے پکڑے حویلی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

جانو حویلی پہنچا تو اُسے باہر کئی لوگ بندوقیں ہاتھ میں لئے پہرہ دیتے دکھائی دیئے۔ وہ ان میں کئی آدمیوں کو پہچان چُکا تھا۔ وہ قادر خاں کے ساتھی ڈاکو تھے۔ اُسے حویلی کے قریب کے مکان کی چھت پر چھپے ہوئے پولیس کے تین سپاہی، تھانیدار اور عبدالحق بھی دیکھ رہے تھے۔ ان سب نے دیہاتیوں کا رُوپ دھارا ہُوا تھا۔ پولیس چاہتی تو جانو کو گوٹھ پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیتی لیکن انہوں نے اپنے منصوبے کے مطابق ایسا نہیں کیا، بلکہ خود یہاں پہلے پہنچ کر اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ تھانیدار نے جب دیکھا کہ پہرے دار جانو کو بندوقوں کے گھیرے میں حویلی کے اندر لے گئے ہیں تو اُس نے وائرلیس سے اطلاع پہنچائی۔ اس کے ساتھ ہی عبدالحق مکان کی چھت سے نیچے اُترنے لگا۔

"ایک گھنٹہ تو ہو گیا ہے سائیں۔ لیکن ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا" وڈیرے نے رام چند سے کہا۔

"کرنا کیا ہے! اپنے آدمیوں سے کہو ایک بچے کو گولی مار کر تھانے کے باہر پھینک آئے" رام چند نے نفرت سے کہا۔

"ٹھہر جاؤ... میں آگیا ہوں" اسی لمحے جانو بندوقوں کے گھیرے میں کمرے میں داخل ہُوا۔ وڈیرے اور رام چند

نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر رام چند بولا "عبدالحق کہاں ہے۔ جب تک وہ یہاں نہیں آئے گا تمہاری بہنوں اور بھائی کو نہیں چھوڑا جائے گا۔"

جانو کا صبر ختم ہو چکا تھا۔ اُس نے وہیں سے ایک جست لگائی اور پلک جھپکنے میں وڈیرے اور رام چند کے قریب آن کھڑا ہوا۔ اس کی چادر گر پڑی تھی اور بندوق کا رُخ دونوں کی طرف تھا۔ وہ گرج کر بولا۔

"اُن سے کہہ دو کہ بندوقیں پھینک دیں ورنہ..." اور اُس نے گولی چلا دی۔ گولی وڈیرے کے پاؤں پر لگی اور وہ زمین پر بیٹھ کر درد سے بلبلانے لگا۔ لیکن پہریداروں میں سے کسی نے بھی بندوق نہیں پھینکی تھی۔

"رام چند اگر تم مجھے قادر خاں کے گروہ میں نہ بھیجتے تو میری ماں نہ مرتی۔ تم میری ماں کے قاتل ہو۔ ان پہریداروں سے کہہ دو کہ بندوقیں پھینک دیں۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا تم میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہو؟ پھینک دو بندوقیں۔" رام چند نے کانپتے ہوئے کہا۔

"تم تو سندھو دیش بنانے کی بات کرتے تھے رام چند! کہتے تھے کہ پاکستانی فوج کا مقابلہ کرو گے لیکن اب تم ایک لڑکے کے آگے ہتھیار پھینکنے کو کہہ رہے ہو۔" ایک پہرے دار نے کہا۔

"لیکن کیا تم میری لاش پر سندھو دیش بناؤ گے احمق؟ بندوقیں پھینک دو۔" رام چند نے اپنے پیٹ میں جانو کی بندوق کی نالی کی چبھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ اس دفعہ پہرے داروں نے بندوقیں پھینک دیں۔ جانو نے یہ دیکھ کر بندوق کا رُخ وڈیرے کی طرف کیا اور کہا۔ "تم نے ہی قادر خاں کو کہہ کر میرے باپ کو مروایا تھا نا۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وڈیرے نے بے بسی سے جانو کی طرف دیکھا۔ بندوق کی لبلبی پر اس کی انگلی کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ لیکن گولی چلنے سے پہلے عبدالحق کی آواز کمرے میں گونجی۔

"گولی نہ چلانا جانو۔ قانون کو ہاتھ میں نہ لو۔ تمہارا انتقام قانون لے گا۔" عبدالحق اور تھانیدار تمام پہرے داروں کے جانو کے ساتھ جانے کے بعد حویلی میں داخل ہو چکے تھے۔ پہریداروں کے بندوقیں پھینکنے پر اب وہ کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ عبدالحق نے فوراً جانو کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی کوشش کی لیکن تھانیدار نے کہا۔ "رائفل جانو کے ہاتھ میں رہنے دیں۔" پھر وہ رام چند اور وڈیرے سے مخاطب ہوا۔ "اگر تم دونوں بتا دو کہ قادر خاں کہاں ہے تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ ورنہ جانو کے باپ کی طرح تمہارے متعلق بھی مشہور ہو جائے گا کہ تم بھی دسایا کی طرح پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے۔"

رام چند اور وڈیرہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جو کنواں وہ دوسرے کے لئے کھود چکے تھے۔ ایک دن اُسی کنویں

میں وہ خود گر پڑیں گے۔ وڈیرے نے کراہتے ہوئے کہا: "مجھے قادر خاں کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے کہ..." وڈیرے کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اُس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اُس کی گردن میں خنجر آر پار ہو چکا تھا۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ خنجر ایک پہرے دار نے مارا تھا، جو قادر خاں کا ساتھی تھا۔ شاید وہ اپنے سردار سے غداری برداشت نہ کر سکا تھا۔ خنجر مارنے کے بعد وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا لیکن تھانیدار کی گولی نے اُسے کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیا۔

"جلدی بتاؤ رام چند۔ تمہارے پاس بہت کم مہلت ہے۔" تھانیدار نے اپنے ریوالور کا رُخ اُس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"قادر خان قتل ہو چکا ہے۔ اس کی لاش اُس حویلی میں پڑی ہوگی جہاں عبدالحق کو قید کیا گیا تھا۔" رام چند نے اطمینان سے کہا۔

"جن رازوں کو چھپانے کے لئے تم لوگوں نے قادر خاں کو قتل کروایا ہے۔ وہ تمہیں بتانے پڑیں گے۔ رام چند۔ عبدالحق پھر تھانیدار سے مخاطب ہوا۔" انسپکٹر صاحب! آپ اس غدار کو گرفتار کر لیں۔"

"تمہاری حکومت مجھے نظر بند یا گرفتار تو کر سکتی ہے عبدالحق لیکن ختم نہیں کر سکتی! مجھے ختم کیا تو سندھ میں لاشوں کے انبار لگ جائیں گے۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔" رام چند نے نفرت سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"جب جانو جیسے نوجوانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ تم جیسے غداروں کی ہمدردی کی اصل حقیقت کیا ہے اور انہیں اَن پڑھ اور غریب رکھنے والے وڈیروں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے تو پھر انشاء اللہ لاشوں کے انبار لگانے والے ڈاکو کہیں نظر نہ آئیں گے۔"

"ادا... آپ مجھے پڑھائیں... پھر آپ دیکھیں گے نہ منظور ڈاکو بنے گا نہ جانو... پھر ہم نہ کبھی رام چند کے دھوکے میں آئیں گے اور نہ کوئی وڈیرہ ہم پر ظلم کر سکے گا۔" جانو نے کہا۔

جب تھانیدار رام چند کو ہتھکڑیاں پہنا رہا تھا تو وڈیرے کا وہی منشی جس نے جانو کو دھکے دے کر نکالا تھا، اُس کی بہنوں اور بھائی کو لے کر آ گیا۔

"مجھے معاف کر دینا بیٹا۔ میں نے تمہارے بھائی بہنوں کا بہت خیال رکھا ہے۔"

جانو کے دل میں اب انتقام کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی رمضان اور حمیدہ کو سینے سے لگا رہا تھا۔

ختم شُد

کچھ ہاکی کے بارے میں

ساجد سعید

(اہم دلچسپ معلومات)

پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ایشیا کے علاوہ اب مغربی ممالک میں بھی بے حد مقبول ہو چکا ہے پچھلے چند برسوں کے دوران ہاکی کے کھیل نے دنیا بھر میں نمایاں ترقی کی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہاکی کے شائقین میں کافی اضافہ ہو چکا ہے اس کے علاوہ اس کے قوانین میں بھی مرحلہ بہ مرحلہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ ہاکی کو دنیا بھر میں متعارف کرانے میں پاکستان کا نمایاں حصّہ رہا ہے۔ ورلڈ کپ، ایشین کپ اور ہاکی کے دیگر ٹورنامنٹ کے انعقاد میں بھی پاکستان کا ہاتھ ہے۔ ہاکی کس طرح کھیلی جاتی ہے؟ اور اس میں کون سے اصول و قوانین ہیں جن میں تبدیلیاں کی جا چکی ہیں؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

ہاکی کا میدان

ہاکی کے میدان کی لمبائی اور چوڑائی بالترتیب ۱۰۰ اور ۶۰ گز تک ہوتی ہے اس طرح گول کے سامنے ایک لائن جس کا فیصلہ بیک لائن سے ۲۵ گز ہوتا ہے گول کے جال کے اندر سطح زمین پر چار گز لمبا اٹھارہ انچ اونچا ایک بیک بورڈ یعنی تختہ نصب کیا جاتا ہے گول لائن کے سامنے بیک لائن سے سولہ گز کے فاصلے پر ایک چار گز لمبی لکیر کھینچی جاتی ہے اور گول لائن کے دونوں کونوں پر متوازی فاصلہ یعنی ۱۶ گز کا

فاصلہ ناپا جاتا ہے اور آخر میں یہ دونوں لائنیں دونوں طرف سے چوتھائی دائرے کی شکل میں بیک لائن سے ملا دی جاتی ہیں اور یہی علاقہ شوٹنگ سرکل کہلاتا ہے۔

ہاکی اور گیند

ہاکی کے کھیل میں استعمال ہونے والی ہاکی کا وزن ۲۸ اونس تک ہوتا ہے اور اس کے بائیں طرف والا حصّہ ہمیشہ ہموار ہوتا ہے ہاکی کا سر نہ تو نوکدار ہوتا ہے نہ ہی اس کے کنارے تیز ہوتے ہیں اس کھیل میں استعمال کی جانے والی گیند ایک مخصوص اور کافی سخت مواد کی بنی ہوتی ہے یہ مواد عام طور پر کارک اور چمڑے وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے اس کا روایتی رنگ سفید ہوتا ہے اور اس کا وزن ۵ ۳/۴ اونس تک ہوتا ہے۔

کھلاڑیوں کی تعداد اور پوزیشنیں

ہاکی کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہونگے کہ اس کی دونوں ٹیموں میں گیارہ گیارہ کھلاڑی جس میں دو گول کیپر ہوتے ہیں جو اپنی اپنی ٹیموں کا دفاع کرتے ہیں اور دورانِ کھیل مخالف ٹیم کو گول کرنے سے روکتے ہیں اس کھیل میں دو ہاف ہوتے ہیں جس میں دونوں ٹیموں کو پینتیس پینتیس منٹ دیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ہاکی کی ٹیم میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں ان کی پوزیشنیں کچھ اس طرح سے ہوتی ہیں۔ (۱) ۔ گول کیپر۔ (۲) ۔ رائٹ فلک بیک ۔ (۳) ۔ لیفٹ فلک بیک ۔ (۴) ۔ رائٹ ہاف۔ (۵) ۔ سینٹر ہاف۔ (۶) ۔ لیفٹ ہاف۔ (۷) ۔ رائٹ آؤٹ۔ (۸) ۔ رائٹ ان۔ (۹) سینٹر فارورڈ۔ (۱۰) ۔ لیفٹ ان۔ (۱۱) ۔ لیفٹ آؤٹ۔

کھلاڑیوں کا لباس

دونوں ٹیموں کے کھلاڑی اپنے کلب یا تنظیم کا منظور شدہ لباس زیب تن کرتے ہیں۔ پیڈز، لمبے دستانے، چہرے کا حفاظتی نقاب اور کہنی کے پیڈز وغیرہ صرف گول کیپر اپنے جسم کی حفاظت کے لئے پہنتے ہیں۔

کھیل کی شروعات

کھیل میدان کے درمیان سے کھیلا جاتا ہے جسے (پاس بیک) کہتے ہیں پاس بیک اسی ٹیم کا

کھلاڑی کرتا ہے جس ٹیم نے میدان کے ہاف کے انتخاب کا حق نہ استعمال کیا ہو۔ کھیل کے دوسرے ہاف میں دونوں ٹیموں کی گول لائن تبدیل ہو جاتی ہے۔

کھیل میں خلاف ورزیاں اور امپائر کا فیصلہ

دورانِ کھیل دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں سے کچھ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزیاں ہو جاتی ہیں جس کے ردعمل میں امپائر دوسری ٹیم کو مندرجہ سہولت فراہم کرتا ہے۔

پنالٹی کارنر اور پنالٹی اسٹروک

دورانِ کھیل کسی ٹیم کا کوئی دفاعی کھلاڑی سرکل یا گول لائن کے اندر کسی ضابطہ کی خلاف ورزی میں ملوث ہوتا ہے تو اس صورت میں حملہ آور ٹیم کو پنالٹی کارنر دیا جاتا ہے اسی طرح جب گول پوسٹ سامنے ہو اور گول کیپر گیند کے اوپر گر جائے تو اس صورت میں پنالٹی اسٹرک دیا جاتا ہے۔

آبسٹرکشن

دورانِ کھیل اگر کوئی کھلاڑی سیدھا کھڑا ہو کر اپنے سامنے ایک ہاتھ کا رخ میدان کی جانب کر کے گھمائے یعنی یہ کہ کوئی کھلاڑی اپنا نصف جسم گھما کر اپنی سمت تبدیل کرنے کی کوشش کرے اور اسکے سامنے والے کھلاڑی کے لئے گیند کھیلنے میں رکاوٹ بنے اور اسی طرح کوئی کھلاڑی کسی دوسرے کھلاڑی کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہے یا کھلاڑی کو بلاک کرے تو ان تمام صورتوں میں اس کا یہ عمل آبسٹرکشن (OBSTRUCTION) کہلائے گا۔

آف سائیڈ

اکثر آپ نے ہاکی کی کمنٹری کے دوران کسی بھی ٹیم کے کھلاڑی کے لئے آف سائیڈ کا لفظ سنا ہو گا یہ لفظ اس کھلاڑی کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کھیل کے دوران جس وقت کوئی بھی کھلاڑی گیند کھیل رہا ہو اگر اس وقت اس ٹیم کا کوئی دوسرا کھلاڑی مخالف ٹیم کے ۲۵ گز کے علاقے کے اندر ہے اور گیند سے دور ہے تو وہ اس صورت میں آف سائیڈ کہلائے گا یہ کھلاڑی جو آف سائیڈ ہے نہ تو گیند کھیل سکتا ہے نہ کھیلنے کی کوشش کر سکتا ہے بعض کھلاڑی اس عمل کے خلاف کرتے ہیں جس کے ردعمل میں امپائر دوسری ٹیم کو فری ہٹ دے دیتا ہے۔

حادثات

اگر کھیل کے دوران کوئی کھلاڑی یا گول کیپر یا امپائر زخمی ہو جائے تو اس صورت میں متبادل آدمی بلایا جاتا ہے اور کھیل وقتی طور پر روک دیا جاتا ہے اور ضائع کیا ہوا وقت دوسرا امپائر نوٹ کرتا ہے اور روکے ہوئے وقت کے مطابق وہ دوبارہ کھیل شروع کرتا ہے کھلاڑی کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ گیند کو پاس دیتے وقت اس حد تک نہ اچھالے کہ اس کا خطرناک ہونے کا اندیشہ ہو اور کھلاڑی کو اس بات کی بھی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ گیند کو جسم کے کسی حصے سے کھیلے صرف گول کیپر ہی اپنا پورا جسم استعمال کر سکتا ہے۔

جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہاکی کے قوانین میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں آیئے ہم آپ کو چند خاص تبدیلیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

دلچسپ قوائد

۱۔ پہلے ہر ٹیم دورانِ کھیل دو سے زیادہ کھلاڑی کو تبدیل کر سکتی تھی لیکن نئے قواعد کی رو سے اب ہر ٹیم دورانِ کھیل صرف کھلاڑیوں کو تبدیل کر سکتی ہے۔

۲۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ پنالٹی کارنر میں لگائی گئی ہٹ سے اگر گیند گول پوسٹ کے اندر چلی جائے اور وہ جال یا سائیڈ بورڈ سے ٹکرا جائے تو اس صورت میں گول مان لیا جاتا تھا لیکن اب یہ اصول رد کر دیا گیا ہے کہ اگر گول پوسٹ میں لگائی گئی پنالٹی کارنر کی ہٹ سائیڈ بورڈ جس کی اونچائی ۱۸ انچ ہوتی ہے اس سے گیند اوپر لگی ہے تو اس صورت میں گول نہیں مانا جائے گا۔

۳۔ اور اس طرح پنالٹی کارنر ہٹ کرنے والا کھلاڑی براہ راست گیند کو گول میں نہیں پھینک سکتا ہے بلکہ اسے گول لائن میں کھڑے اپنے ٹیم کے کسی بھی کھلاڑی کو پاس کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ کسی یقینی گول کو گول کیپر اپنی ہاکی کندھے سے بلند کر کے بچالے تو اس صورت میں اس ٹیم کو پنالٹی اسٹروک دیا جاتا ہے۔

۵۔ اگر کوئی دفاعی کھلاڑی اپنی پچیس گز کی حدود کے اندر خلاف ورزی کرے اور امپائر کی نظر میں یہ خلاف ورزی دانستہ ہو تو حملہ آور ٹیم کو پنالٹی کارنر دیا جاتا ہے۔

۶۔ سینٹر لائن اور کارنر کے تعین کے لئے کھیل کے پورے اوقات کے میں میدان کے

چاروں کونوں پر اور سینٹر لائن کے دونوں کونوں پر چار اور پانچ فٹ کے درمیان اونچی جھنڈیاں نصب کی جاتی ہیں۔

۷۔ انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن کے جدید قوائد کی رو سے کھلاڑیوں کو ایسے جوتے جو نوکدار کیل، اسٹڈز یا اُبھرے ہوئے کیل سے بنے ہوں ان کو پہننے کی اجازت نہیں اور نہ ان کو ایسی چیز زیب تن کرنے کی اجازت ہوگی جو دوسرے کھلاڑیوں کے لئے خطرے کا باعث بنے۔

۸۔ اگر مخالف ٹیم کا کوئی کھلاڑی دوسری ٹیم کے کھلاڑی کی ہاکی میں ہاکی مار دے، دھکہ دے یا ہاکی سے اس کے جسم پر ضرب لگائے، انڈر کٹنگ کرے، گیند کو خطرناک حد تک اچھالے وغیرہ اس صورت میں امپائر ایسے کھلاڑیوں کے لئے سخت سزا تجویز کرے گا۔

۹۔ اگر کوئی دفاعی کھلاڑی سرکل کے اندر فری ہٹ کو روکتے ہوئے گیند کو خطرناک حد تک اچھال دے تو اس کی ٹیم کے خلاف پنالٹی کارنر دیا جاتا ہے۔

۱۰۔ پُش یا ہٹ کرتے وقت گیند کو قصداً نہیں اچھالا جائے گا اور گیند کو ہٹ کرتے وقت گیند کا اپنی جگہ ساکن ہنا لازمی ہے۔

ہاکی میں بین الاقوامی طور پر سمجھنے والے اشارے یہ ہیں۔

(۱) بُلی دونوں ہاتھوں سے بُلی کرنے کی حرکت کرنا۔

۲۔ آبسٹرکشن سیدھے کھڑے ہو کر اپنے سامنے ایک ہاتھ کا رخ گراؤنڈ کی طرف کر کے دائرہ کی شکل میں گھمانا۔

۳۔ آف سائیڈ جہاں ہٹ دینا مقصود ہو وہاں کھڑے ہو کر ایک بازو سیدھا اٹھا کر ہٹ کی طرف اشارہ کرنا۔

۴۔ فری ہٹ ایک بازو سیدھا اٹھا کر ہٹ کی طرف اشارہ کرنا۔

۵۔ کارنر ایک بازو سے کارنر فلیگ کی طرف اشارہ کرنا۔

۶۔ پنالٹی کارنر اس گول کی طرف امپائر کا اشارہ کرنا جس طرف پنالٹی کارنر لگایا جاتا ہو۔

۷۔ پنالٹی اسٹروک ایک ہاتھ سے پنالٹی اسٹروک کے نشان کی طرف اشارہ کرنا اور دوسرے ہاتھ کو آسمان کی طرف بلند کرنا۔

۸۔ وقت کا ٹھہرنا دوسرے امپائر یا ٹائم کیپر کی طرف رخ کر کے دونوں کلائیوں سے اپنے سر کے اوپر صلیب کا نشان بنانا۔

۹۔ گول کیا جانا چک کاٹ کر دونوں بازوؤں سے میدان کے مرکز کی طرف اشارہ کرنا۔

۱۰۔ سولہ گز کی ہٹ دونوں بازوؤں کو سیدھا سائیڈ لائنوں کی طرف پھیلا دینا۔

اس وقت پاکستان کی قومی ٹیم ایشین چیمپئن ہے۔ مشکل وقت میں پاکستان کے ہاکی کے کھلاڑیوں نے ہمیشہ عالمی سطح پر پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قومی ٹیم ہمیشہ عالم میں اپنا نام پیدا کرتی رہے۔

(آمین)

گزشتہ ماہ شائع ہونے والی "انجانی مہم" کی قسط کے ساتھ لکھنے والے کا نام سہواً محمد نوید مرزا شائع ہو گیا تھا جبکہ یہ قسط فہیم ساغر صاحب نے تحریر کی تھی، اس سہو پر ہم فہیم ساغر صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

انجانی مُہم

م۔ا۔راشد

صفدر ، منصور اور ذ ن آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دوران سفرایک پراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈورڈ کاایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم جاکر منصور نے پرچی دیکھی تواس پر درج تھا کہ...... ھو بڑ ناثواگ ہوام یا...... یعنی یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے...... منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا سے اسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا۔ لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑکر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتہ چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر

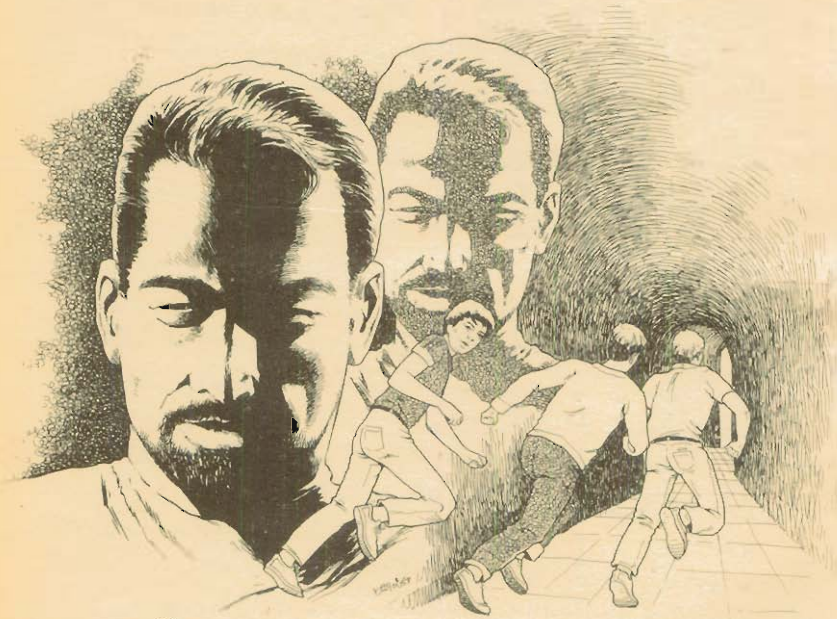

رکی اور پھر چل پڑی۔ جس علاقے سے ٹرین گزر رہی تھی وہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اور تلاشی لینا چاہی، مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیوٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم میں گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹ اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی جب شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلایا..... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سر کے ہوئے بیٹ کو ہٹا کر دیکھا اور ان پر پستول تان لی..... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا نیلے کوٹ والا۔ ٹیکسی چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں گھنی جھاڑیوں میں سے ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ اندر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے میگھاری نام کا ایک شخص انہیں ملا۔ یہ چیف باس کا نائب تھا۔ وہاں موجود غنڈے اور میگھاری ان تینوں کو کرنل رحمٰن کے حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے تینوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے خالو کے گھر پہنچے تو وہاں سے تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں میگھاری۔ دھاریوال اور ان کے خالو کی تھیں۔ دھاریوال کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے جو دیکھا اس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔

جمبو اور گیٹو ان کو گھر کے اندر لے گئے۔ وہاں ان پر انکشاف ہوا کہ صفدر کے خالو بھی ان بدمعاشوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر صفدر کے خالو ..... حاجی کمال بیگ نے ایک ٹرانس میٹر پر اپنے باس کو کرنل رحمان کے ارکان کو پکڑ لئے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد میگھاری ان کو لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین اور غنڈے بھی تھے۔ مگر منصور نے چالاکی سے کام لیا تینوں لڑکوں نے ان بدمعاشوں پر قابو پا لیا۔ پھر منصور نے ان کے کوارٹر کا پتہ معلوم کیا۔ اور ان کو اس طرف لے چلا۔ ابھی ان کے پیدل سفر کا آغاز ہی ہوا تھا کہ انہیں آواز آئی "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

یہ آواز حاجی کمال بیگ کی تھی جو آستین گن لے ان کی طرف آ رہا تھا۔ کمال کو دیکھ کر جمبو اور میگھاری کو بہت تعجب ہوا۔ اتنے میں انہوں نے دھاریوال کو زخمی حالت میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر وہ تینوں صفدر ذیشان اور منصور کو لے کر اپنے بگ باس کے پاس پہنچے۔ باس نے کمال کو ان تینوں کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ کمرے میں پہنچ کر منصور نے منہ ڈھانپ کر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص پر حملہ کیا مگر اس کے گرد شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ تبھی منصور اور کمال پر چھت سے پانی برسنے لگا۔ جس سے منصور ہوش میں آ گیا اور کمال کا میک اپ اتر گیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ کمال نہیں کرنل رحمٰن تھے۔ یہ دیکھ کر یہاں لڑکوں کو حیرت ہوئی۔ بگ باس یعنی ہاکسن ولیم کو یہ بات معلوم تھی کہ کرنل رحمٰن کمال کے بھیس میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔ پھر ان تینوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرے میں تینوں لڑکوں نے کرنل رحمٰن سے ان تینوں تک پہنچنے کی تفصیلات پوچھیں۔ تھوڑی دیر بعد اصلی کمال پولیس سے رہا ہو کر وہاں آ پہنچا اور باس کی ہدایت پر ان چاروں کو لے کر ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔ پھر لفٹ کے ذریعے انہیں اس زمین دوز بستی میں

لے جایا گیا جہاں انتہائی بڑی بڑی شخصیتیں اغواء ہونے کے بعد سے قید تھیں۔ ان سب کے نام بستی کی ایک اسکرین پر چاروں کے سامنے ظاہر ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نام دیکھ کر وہ سب چیخ اٹھے۔

اسکرین پر کرنل نقوی کا نام روشن تھا جن کے بارے میں اطلاع تھی کہ انہیں حکومت نے گرفتار کر کے انتہائی سخت حفاظت میں رکھا ہے۔ دھاریوال نے ان چاروں کو بتایا کہ دراصل قید ہونے والا کرنل نقوی، کرنل نقوی کی ڈمی ہے۔ پھر ان چاروں کو خوبصورت کمروں میں قید کر دیا گیا جہاں ویڈیو کیمرے اور مائکروفون نصب تھے تھوڑی دیر بعد دھاریوال ان چاروں کو لے کر زمین دوز بازار کی سیر کو نکلا۔ بازار میں بہت سے لوگ مخصوص ٹوکنوں کے ذریعہ خریداری کر رہے تھے۔ یہ ٹوکن انہیں منشیات اور اسلحہ ساز فیکٹریوں میں کام کرنے کے عوض ملے تھے۔ ان چاروں کو بازار میں موجود کسی شخص سے بات چیت کی اجازت نہ ملی وہ گھومتے گھومتے فیکٹریوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک فیکٹریوں کے سائرن زور سے چیخنے لگے۔ دراصل کرنل رحمٰن دھاریوال کی نظر بچا کر فیکٹری کے اس کمرے میں پہنچ گئے تھے جہاں کمپیوٹر نصب تھے۔ تھوڑی دیر بعد فیکٹری سے دھماکے کی آواز آئی۔ دھاریوال کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

دھماکے کے باعث اس زمین دوز شہر کے در و دیوار ہل گئے تھے۔ دکانوں اور فیکٹریوں کے دروازوں اور کھڑکیوں میں لگے ہوئے شیشے چکنا چور ہو کر زمین پر بکھر گئے تھے۔ بعض افراد جو خریداری میں مصروف تھے فضا میں اڑتے ہوئے دور جا گرے تھے۔ عجیب بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا چیختا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ ذیشان، منصور اور صفدر بھی ابھی تک کانوں میں انگلیاں ٹھونسے کھڑے تھے۔ دھاریوال کی عجب حالت تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ محفوظ اور مضبوط پہرے کے باوجود کرنل رحمان نے فیکٹری کو دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ بالکل خواب جیسی کیفیت تھی۔ لیکن جلد ہی اسے اس کیفیت سے باہر نکلنا پڑا جب ذیشان کی ایک فلائنگ کک اسکے سینے پر پڑی اور وہ پیچھے کی جانب لڑھک گیا۔

"بھاگو" ذیشان کی آواز سنائی دی اور صفدر اور منصور نے بھی ذیشان کے ساتھ ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ وہ کبھی لوگوں سے ٹکراتے اور کبھی خود کو بچاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ انجانی منزل کی طرف۔ اچانک ذیشان ایک دم سے رکا اور اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"کرنل رحمان کہاں ہیں"

"ارے ہم تو انہیں بھول ہی گئے تھے۔" صفدر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہمیں انہیں تلاش کرنا چاہئے۔" ذیشان نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

اب وہ لوگ واپس اس طرف جا رہے تھے۔ جدھر دھماکا ہوا تھا۔ جب ان کا گزر اس جگہ سے ہوا جہاں انہوں نے دھاریوال سے نجات حاصل کی تھی تو دیکھا دھاریوال زخمی حالت میں ایک طرف

پڑا کراہ رہا ہے۔ بھاگتے ہوئے لوگوں کے ہجوم نے اسے بری طرح کچل کر رکھا دیا تھا۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ خود سے اٹھ کر بیٹھ سکے۔

"یہ تو اپنے انجام کو پہنچا" صفدر نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"بُرے لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے صفدر صاحب" منصور نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ اپنے گناہوں کا عذاب بھگتنے کے لئے پھر زندہ بچ جائے گا۔"

"ارے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، کرنل رحمان کی فکر کرو۔" ذیشان نے کہا اور یہ تینوں پھر اس کنٹرول روم کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن انہوں نے ابھی چند قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک دیوار کی اوٹ سے کرنل رحمان نمودار ہوئے۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

"ہیلو نوجوانوں" کیسے ہو، کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں لگی؟ انہوں نے قریب آکر ان کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ہم تو ٹھیک ہیں انکل، آپ اپنی سنائیں۔" صفدر نے خوشی سے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تو کمال ہی کر دیا انکل، ذیشان بولا" لیکن آپ غائب کیسے ہوگئے تھے۔ اور کنٹرول روم میں پہنچے کیسے؟

"بھئی کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری تفصیلات معلوم کرلو گے، پہلے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں تو سوچو" کرنل رحمان بولے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ کس قدر نازک صورت حال سے دوچار ہیں۔

"اوہ انکل میں تو بھول ہی گیا تھا" ذیشان نے کہا یقیناً ہمیں یہاں سے فوراً رفو چکر ہوجانا چاہئے۔

لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" منصور نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"یہاں یقیناً کوئی راستہ ایسا ہوگا جہاں سے ان لوگوں نے اپنے بُرے وقت میں فرار ہونے کی گنجائش رکھی ہوگی۔ بس ہمیں وہی راستہ تلاش کرنا ہے۔" وہ باتیں کرتے ہوئے ایک جانب کو چلے جارہے تھے۔ اچانک صفدر کسی خیال کے تحت چونک پڑا۔

"انکل" اس نے کرنل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟" کرنل رحمان نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"انکل مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ جس طرف ہم لوگ پہلے بھاگے تھے ادھر ایک نیم تاریک سی گلی تھی۔ ممکن ہے وہ کوئی قدرتی غار ہو جو باہر پہاڑوں میں جا نکلے۔ کیوں نہ ہم ادھر سے اپنی تلاش کا آغاز کریں۔" صفدر نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں انکل وہ گلی تو ہم نے بھی دیکھی تھی" ذیشان اور منصور نے بیک زبان کہا۔

"تو ٹھیک ہے ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔" کرنل رحمان نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

اور پھر سب لوگ واپس اس طرف جانے لگے جدھر یہ غار نما گلی موجود تھی۔

رستے میں زخمی دھاریوال کو انہوں نے ایک مرتبہ پھر دیکھا۔ کرنل اس کے قریب گئے اور جھک کر اسکی نبض ٹٹولی۔

"بے ہوش ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ اب بچے گا نہیں۔" کرنل نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

"دفع کریں انکل" یہاں سے نکلنے کی فکر کریں۔" ذیشان نے کہا۔ اور وہ سب لوگ ایک بار پھر اسی غار کی جانب چلنے لگے۔ جلد ہی وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔ یہ ایک طویل سرنگ نما گلی تھی۔ کرنل رحمان، ذیشان، منصور اور صفدر نے اللہ کا نام لیا اور اس سرنگ کے اندر داخل ہوگئے۔ ذرا آگے جاکر یہ گلی مزید تنگ ہوگئی تھی۔ اب ان چاروں کے لئے ساتھ ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بلکہ سب آگے پیچھے ایک قطار کی صورت میں آگے بڑھ رہے تھے، کرنل رحمان سب سے آگے تھے۔ سفر خاموشی سے جاری تھا۔ صرف ان لوگوں کے چلنے کی آہٹ فضا میں گونج رہی تھی۔ ایک عجیب بات انہوں نے یہ محسوس کی کہ اس طویل سرنگ میں سفر کرتے ہوئے انہیں ابھی تک روشنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی کسی قسم کی گھٹن تھی۔ پوری سرنگ میں یکساں نیم تاریکی سی تھی۔ جس میں رستہ تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

"یہ سرنگ تو شیطان کی آنت معلوم ہوتی ہے۔" صفدر نے طویل خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ ہم اس وقت بگ باس کے پیٹ میں سفر کر رہے ہیں۔" ذیشان نے

کہا تو سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"ہاں بھئی ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ بگ باس بھی کسی شیطان سے کم تو نہیں ہے۔" کرنل رحمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ شیطان بھی اسے بگ باس ہی کہتا ہوگا۔" منصور نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کافی دیر تک مسلسل چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچے جو ایک کمرے کی شکل میں تراشی گئی تھی۔ اس میں ایک طرف کی دیوار میں لوہے کا ایک مضبوط دروازہ نظر آرہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس دروازے کے پار سیڑھیاں ہوں گی۔ جو اوپر کسی غار تک ہماری رہنمائی کر سکیں گی۔ منصور نے کہا۔

"ہوں اچھا خیال ہے۔ آدمی کو اچھی ہی امید رکھنی چاہئے"۔ ویسے ممکن ہے کہ اس دروازے کی دوسری طرف کوئی نئی مصیبت ہماری منتظر ہو۔" ذیشان نے یہاں بھی اپنی جاسوسانہ حس کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی اس دروازے کو کھولنے کی کوئی سبیل کرو۔" دوسری طرف کیا ہوگا یہ بعد میں دیکھ لیں گے۔

کرنل رحمان نے کہا۔ وہ خود بھی دیواروں کو ٹھونک بجا کر اس بھاری بھرکم دروازے کا میکنیزم تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے توجہ دلانے پر یہ تینوں بھی دیواروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر جیسے ہی کرنل رحمان نے ایک ابھرے ہوئے پتھر کو پورے زور سے نیچے کی طرف دبایا۔ وہ دیوہیکل دروازے خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ چھت کی طرف اٹھتا چلا گیا اور یہ چاروں اس خلا سے اندر داخل ہوگئے جو دروازے کے اوپر اٹھ جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اندر کافی اندھیرا تھا۔ اور یہ اندھیرا اس وقت اور گہرا ہوگیا جب وہ دروازہ دوبارہ اسی خوفناک آواز کے ساتھ اپنی سابقہ جگہ پر آگیا۔

"یہ کیا ہوا؟ اندھیرے میں صفدر کی خوفزدہ آواز گونجی..... اس نے مضبوطی سے اپنے پاس کھڑے ہوئے ذیشان کا بازو تھام لیا تھا۔ منصور نے پہلے ہی ذیشان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ابھی وہ لوگ اس صورت حال سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ کمرے کی تنگ فضا میں قہقہے گونجنے لگے۔ اتنی دیر میں ان

کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوچکی تھی..... تب انہوں نے دیکھا کہ انکل رحمان ان کے سامنے کھڑے پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"انکل آپ؟" منصور نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں..... بے وقوفو! میں کرنل رحمان نہیں ہوں بلکہ بگ باس کا ایک ادنا خادم ہوں۔"

"لیکن آپ کی شکل..... اوہ میں سمجھا" تم بھی کرنل کی ڈمی ہو۔ ذیشان کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔

"ہاں میں کرنل کی ڈمی ہوں اور تمہیں وہاں تک لے آیا ہوں جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں جاسکا۔" اس نے بھیانک انداز میں انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر دیکھو اپنے دائیں طرف" سب کی نظریں خود بخود ادھر اٹھ گئیں ایک دیوار میں جنگلہ سا لگا ہوا نظر آرہا تھا۔ اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ ادھ موئے ہوئے پڑے تھے۔

"یہ سب کون ہیں" ذیشان نے سوال کیا

"یہ سب تمہاری طرح احمق ہیں" انہوں نے بھی باس سے غداری کی تھی اور آج اس کیبن میں بھوکے اور پیاسے پڑے ہیں۔ ان میں سے کچھ مرچکے ہوں گے اور کچھ مرنے والے ہیں۔"

"بکواس کرتے ہو۔ اگر یہاں مُردہ انسان ہوتے اس وقت بدبُو سے ہمارا دماغ پھٹ رہا ہوتا۔ لیکن ہمیں تو یہاں ذرا بھی بدبو کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"آہا، بقراط بڑی دور کی کوڑی لائے ہو۔ اس نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"لیکن تم یہ کیوں بھول گئے کہ جو انسان زیر زمین ایک پوری دنیا آباد کر سکتا ہے وہ ذرا سی بدبُو کو قابو نہیں کر سکتا؟"

"لیکن تم لوگ....."

مگر اس کی آواز شور میں دب گئی جو دروازے کے کھلنے سے پیدا ہوا تھا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ اب یہاں کون آیا تھا۔ ذیشان منصور اور صفدر اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ اب کون سی بلا نازل ہوئی تھی۔ لیکن جب اس بلا پر ان کی نظر پڑی تو ایک بے ساختہ چیخ صفدر کے منہ سے نکلی۔

"انکل رحمان"

اس وقت دو رحمان آمنے سامنے موجود تھے، دروازہ ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔ ذیشان کو اب بھی شک تھا کہ ان دونوں میں کوئی اصلی رحمان بھی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ اچانک ڈمی کرنل رحمان اپنی جگہ سے اچھلا اور فلائنگ کک اپنے مدمقابل کے سینے پر رسید کی۔ وہ چوٹ کھا کر پیچھے کی جانب گرے مگر بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک بار پھر دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی لئے پر تول رہے تھے۔ ذیشان اور اس کے ساتھیوں نے چاہا تھا کہ ڈمی کرنل رحمان کو چھاپ لیں لیکن اصل کرنل رحمان نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا تھا۔

"میں اس انسانیت کے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا" انہوں نے غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ذیشان، منصور اور صفدر ایک طرف دیوار کے ساتھ جا کر کھڑے ہو گئے۔

کمرے کے درمیان میں دونوں رحمان ایک خطرناک فری اسٹائل جنگ میں مصروف تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ سینے پر پڑنے والی ایک کک کے نتیجے میں اصل کرنل رحمان ذیشان کے پاس آ گرے۔ انہوں نے اٹھنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن وہ ڈمی رحمان ان سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور بائیں طرف کی دیوار میں لگا ہوا ایک خفیہ بٹن دبا دیا لوھے کا ایک جنگلہ تیزی سے چھت سے زمین کی طرف آیا اور ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ یہ لوگ اس جنگلے کے پیچھے قید ہو چکے تھے۔ اور حیرت سے اس ڈمی رحمان کو دیکھ رہے تھے جو اپنے ہونٹوں سے بہنے والے خون کو صاف کرتا ہوا ان کی طرف گھور رہا تھا۔

"اب تم یہاں موت کا نظارہ کرو گے۔" اس نے نفرت سے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

"بزدل ہو تم" سلاخوں کے پیچھے بند کر کے اب بڑھکیں لگا رہے ہو۔" کرنل نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ورنہ میں تمہیں دل کی حسرت نکالنے کا موقع ضرور دیتا۔" اس نے کرنل کے مذاق سے چڑ کر کہا۔

"ہونہہ..... بہانے بنا رہے ہو۔" کرنل نے اسی لہجے میں کہا۔

"جو بھی سمجھو میں تمہاری باتوں میں آ کر یہ جنگلہ تو ہٹانے سے رہا۔ ہاں اتنا بتا دیتا ہوں کہ وہ

فرش جس پر تم کھڑے ہو پتھر کا نہیں لوہے کا ہے اور میں اب جو بٹن دبانے جا رہا ہوں وہ تمہاری موت کا پیغام ثابت ہو گا۔ صرف چند لمحے میں بجلی کا کرنٹ تمہاری ساری بہادری اور ذہانت کا حساب برابر کر دے گا۔"

اس نے کرنل کا جواب سنے بغیر دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اچانک ان چاروں کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے جسموں میں انگارے بھر دیئے گئے ہوں وہ ایک ناقابل بیان اذیت سے دو چار تھے۔ فضا ان کی چیخوں اور ڈمی کے قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ کمرے میں ایک شور بپا تھا۔ مگر پھر اس شور پر ایک اور آواز غالب آ گئی۔ ایک بڑے شور کی آواز...... زمین اپنی پوری شدت سے ہل رہی تھی۔ وہ لوگ کبھی دائیں لڑھک رہے تھے کبھی بائیں۔ اب ان کی چیخوں میں ان نیم مردہ افراد کی چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں جو دوسرے جنگلے کے پیچھے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر یہ شور ایک دم ختم ہو گیا۔ پہاڑ کا وہ تراشیدہ حصہ جو چند لمحے پہلے تک چھت کہلاتا تھا۔ یک دم فرش پر آ رہا۔ اور ہر چیز اس کے نیچے دب گئی۔ شور بھی۔ انسان بھی..............

انجانی مہم کے سلسلے میں جن لکھنے والوں کی کہانیاں موصول ہوئیں اُن کے نام یہ ہیں.
۱۔ فہیم ساغر ۔ اوگرہ مانسہرہ ۲۔ محمد شاہد فیروز ۔ گوجرانوالہ ۳۔ علی گوھر ۔ کراچی
۴۔ محمد رضوان مغل ۔ ناریتھ ناظم آباد کراچی

آپ کو یاد ہو گا "انجانی مہم" کی پہلی قسط ملک کے مشہور ادیب ڈرامہ نگار اور شاعر جناب امجد اسلام امجد نے لکھی تھی۔ اور اس کے بعد آنکھ مچولی کے قارئین نے اس سلسلہ وار کہانی کو آگے بڑھایا تھا۔ کہانی اب بے حد دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ بلکہ ایک ایسے مرحلے میں جسے کلائمکس کہا جاتا ہے۔ اور اچھے کہانی کار ایسے ہی موقع پر کہانی کو ختم کر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو کہانی یاد رہ جائے۔ ہم نے "انجانی مہم" شروع کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اس کی آخری قسط امجد اسلام امجد ہی لکھیں گے۔ قارئین نے اپنے حصے کا کام مکمل کر دیا اور کہانی کو ایسے موڑ پر پہنچا دیا جس کا تصور بھی اس کی پہلی قسط پڑھ کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگلے شمارے میں اس کہانی کے اصل خالق امجد اسلام امجد کہانی کو اپنے انجام تک کس طرح پہنچاتے ہیں۔ یقیناً ہمارے ذہین اور باصلاحیت قارئین نے انہیں ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنا قلم جیب میں رکھ لیں۔ ان کے قلمی تعاون کا بے حد شکریہ۔ (ادارہ)

غزل پزل

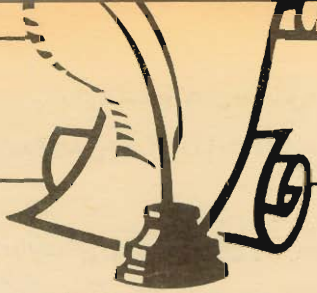

محمد سلیم مغل

مقابلہ معلومات عامہ کے سلسلے میں دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد لیجئے اب ہم بالکل نئے اور اچھوتے طرز کے مقابلے کے ساتھ حاضر ہیں۔ امید ہے کہ ذہانت اور معلومات کا یہ دلچسپ سلسلہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

آیئے پہلے اس نئے طرز کے مقابلے کو سمجھ لیں ..... دوسرے صفحہ پر ہم مع ۱۰ تصاویر، اسکیچز یا علامتیں شائع کر رہے ہیں آپ نے انہیں پہچاننا ہے۔ یہی آپ کا امتحان ہے آپ کی مدد اور راہنمائی کے لئے ان علامتوں یا تصاویر کے ساتھ ہی ہم ۱۰ اشعار پر مشتمل ایک غزل بھی شائع کر رہے ہیں۔ غزل کا ہر شعر تصویر یا اسکیچ کی شناخت میں آپ کا مدد گار ہوگا۔

اپنے جوابات کوپن کی شکل میں ماہ رواں کی ۱۵ تاریخ تک ہمیں بھجوا دیجئے۔ تمام درست جوابات بھجوانے والے ساتھیوں کے نام قرعہ اندازی کے ذریعہ تین انعامات حاصل کرنے والوں کے نام آئندہ ماہ کی اشاعت میں جگہ پائیں گے تو پھر ہو جایئے تیار ..... مقابلہ حاضر ہے .....

جوابات

(۱) ..... (۲) ..... (۳) ..... (۴) ..... (۵) .....

(۶) ..... (۷) ..... (۸) ..... (۹) ..... (۱۰) .....

نام ..... عمر ..... کلاس .....

پتہ .....

غصّے سے چلاّتی آنکھیں ، غرّاتا انسان
دو جنگوں میں جلتی دنیا اسکی ہے پہچان

آزادی کی روشن کرنیں جس کے دَم سے پھیلیں
اس راہبر کو کیسے بھولیں وہی ہے سب کا مان

فرّاٹے سے بھرنے والی ہَوا سے باتیں کرنے والی
سڑکوں سڑکوں دوڑ رہی ہے کتنی عالیشان

جُھک جُھک کر بھی گر نہ پائے کوئی آنچ نہ آئے
آنکھیں محوِ حیرت ہیں اور عقل بھی ہے حیران

اسکے ساتھ ہی کرگس بھی ہے گو محو پرواز
اُسکا اور جہان ہے ساتھی اس کا اور جہان

دھرتی کھو بیٹھے ہیں جو وُہ واپس لینی ہے
اس کو حاصل کرنے میں خواہ جائے اپنی جان

تیزی سے او جانے والے یہ بھی ہوش رہے
ننھے بالک گزر رہے ہیں بھٹک نہ جائے دھیان

لہراتے پرچم کے نیچے دنیا ایک ہوئی
اب شائد ہوجائے پیدا امن کا کچھ امکان

زیتوں کی ڈالی کو تھامے کرتا ہے پرواز
پنچھی کیا کہتا ہے ہم سے ، کچھ سمجھے نادان؟

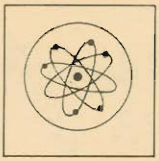

اِک مرکز کے چاروں جانب گردش جاری ہے
گردش کرنے والے ان ذرّوں کو تو پہچان

روشنیوں اور ہنگاموں کے شہر کراچی کے پس منظر میں

مشہور ڈرامہ نگار حمید کاشمیری کا نیا ناول

آنکھ مچولی کی ایک شاندار اور فخریہ پیش کش

یہ ایسے بچوں کی کہانی ہے جو منشیات ، لسانی فسادات ، تخریب کاری اور قتل وغارت گری کے ماحول میں اپنے مستقبل سے بے خبر پرورش پا رہے ہیں۔

قدم قدم پر حیران کُن واقعات جن میں تجسّس بھی ہے اور مہم جوئی بھی

بہت جلد آنکھ مچولی میں سلسلے وار ملاحظہ کیجئے

لُوسی

شاہد جمیل

لُوسی بہت خوبصورت بلّی تھی۔ اسے میں نے پالا تھا۔ وہ جب چھوٹی سی تھی، اور جب ایک دن اُس کی ماں اپنے دانتوں سے پکڑ کر اس کو میرے گھر لائی تو پہلی نظر میں مجھے وہ بہت پیاری لگی تھی۔ اور اُسی وقت میرا دل چاہا تھا کہ اُس کو میں اپنے پاس رکھ لوں۔ لیکن اُس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور اس کی ماں کو اس سے اتنا پیار تھا کہ وہ ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی اور کہتے ہیں کہ بلّی کی مامتا سب مامتا سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس کے بچے کی طرف اگر کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے تو اس پر جھپٹتی ہے۔ اور کوئی ہاتھ لگانا چاہے تو اُس پر شیر کی طرح حملہ کر کے اُس کی کوشش ناکام بنا دیتی ہے۔

لیکن اس بلّی کے ساتھ قدرت کا کھیل کچھ اور ہی طرح کا نظر آیا۔ میری لوسی کو اُس نے جوں ہی فرش پر رکھا وہ دوڑ کر میرے پاس آگئی۔ بلّی تو ہکا بکا ہو گئی۔ وہ مارے حیرت کے جیسے فرش سے چپک گئی تھی۔ جھپٹنا اور حملہ کرنا تو دُور کی بات ہے، وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

لوسی میرے پاس آگئی، تو اُس کے ریشم جیسے بالوں کو اپنی انگلیوں سے چھو کر میں نے پیار کیا۔ بلّی کچھ نہ بولی۔ پھر میں نے اس کو گود میں اُٹھا لیا پیار کیا اور میرے ہونٹوں پر ایک نام آگیا "لوسی" بلّی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ یہ جنگلی بلّی تھی۔ قدرت کے اصولوں سے جتنی واقفیت جانوروں کو ہے ہمیں نہیں ہوتی۔ امّی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں بہت زور سے ڈانٹ کر بولیں۔

"نہ کرو پیار اُسے۔ اگر دیکھ لیا گھر کا راستہ اس نے، تو جینا دو بھر کر دے گی ہم لوگوں کا" امّی بلی سے الرجک تھیں۔

"کیا امّی! کتنی پیاری ہے دیکھیے تو!" میں اسی طرح سفارش کر سکتا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں پھینکو اس کو" امّی نے حکم دیا۔

"میں نے اس کا نام لوسی رکھا ہے امّی! آپ کو پیاری نہیں لگتی؟" میں اپنے طور پر امّی کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن امّی کو بلّی سے ازلی نفرت تھی۔ وہ کسی قیمت پر بلّی کو رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ اور اس کی وجہ جانے کیا تھی۔ بس بلّی کو دیکھتے ہی جیسے ان پر چیخنے چلّانے کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس کے برخلاف میں ہر قیمت پر لوسی کو پالنا چاہتا تھا۔ اور اس کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے سینے سے لگا کر۔

بلّی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ لوسی میری گود میں تھی اور امّی چیخ رہی تھیں۔

"اس لڑکے کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو تو ذرا کسی بات کا احساس ہی نہیں۔ میری بات تو اس طرح سُنی ان سُنی کر دیتا ہے کہ جیسے میں اس سے نہیں کسی اور سے کہتی ہوں۔ ارے او لڑکے! میں تجھ سے کہہ رہی ہوں۔ تو اسے پھینکے گا یا نہیں یہ بتا دے مجھے!..."

آخری وقت آگیا تھا جواب دینے کا اور امّی کی اس سختی کے بعد میری کیا مجال تھی کہ میں اپنی زبان ہلا سکوں یا لوسی کو اپنی گود میں رکھ سکوں۔ ایک دم سے بجلی کی طرح ایک رو آئی میرے دماغ میں اور میں نے سوچا کہ میں صاف صاف امّی سے کہہ دوں کہ چاہے آپ کچھ بھی کر لیں، میں لوسی کو پھینک نہیں سکتا۔ اور جُوں ہی یہ الفاظ میری زبان پر آنا چاہتے تھے کہ تیزی کے ساتھ ابّو گھر میں داخل ہوئے۔ ان کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

امّی ان کو اس حال میں دیکھتے ہی گھبرا گئیں۔ دوڑ کر ان کے پاس گئیں۔ پوچھنے پر ابّو نے بتایا کہ اچانک بسوں کی ہڑتال ہو گئی تھی۔ پتھراؤ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر ان کی پیشانی پر بھی آ لگا۔ امّی نے جلدی سے گھر

کا فرسٹ ایڈ بکس کھولا۔ مرہم پٹی کی اور ابّو کی خدمت میں لگ گئیں۔ میں نے جلدی سے لوسی کو چھوڑ دیا۔ اور وہ اپنی ماں سے جا ملی اور اس کی ماں اس کو لے کر گھر سے باہر چلی گئی۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ امّی دیکھ رہی تھیں۔ ڈانٹ کر انہوں نے کہا

"بند کرو دروازہ اور خبردار جو آئندہ میں نے بلّی تمہارے ہاتھ میں دیکھی ہے!"

"کیا ہوا؟" بستر پر لیٹے ہوئے ابّو نے پوچھا۔

"جانے کہاں سے ایک بلّی آگئی بچّہ لیے ہوئے۔ اور یہ جو آپ کے لاڈلے ہیں۔ انہوں نے اس بچے کو لوسی بنالیا۔" امّی کا انداز ایسا تھا بتانے کا کہ ابّو ہنس پڑے۔ جلدی سے پوچھا۔

"لوسی بنالیا۔ کیا مطلب؟"

"اُس کا نام لوسی رکھا ہے اِس نے۔ لوسی! لوسی کہہ رہا تھا گود میں لے کر۔"

"تو پورا نام رکھو نا لُوسی گرے!" کہہ کر ابّو زور سے ہنس دیے "کیوں؟"

لیکن میرے منہ سے کوئی جواب نہ نکلا۔ میرا مذاق اُڑایا جارہا تھا۔ میں نے پھر بھی اپنے جذبات پر قابو پاکر موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سوچا کیوں نہ اسی وقت لوسی کو اپنے پاس رکھنے کی ابّو امّی سے منظوری لے لوں۔ میں نے بڑے ملتجیانہ انداز میں دونوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں اس کو پالنا چاہتا ہوں۔"

"کیا! کیا۔ اور سُنیے۔ میں ایک منٹ اس کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتی اور تُو اس کو پالنا چاہتا ہے چوبیس گھنٹے مجھے ستانا چاہتا ہے؟"

"نہیں نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔" ابّو نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"پھر کیسی بات ہے؟" امّی نرم پڑ گئیں اور اس کی وجہ معقول تھی کہ ابّو کا سر زخمی تھا۔ امّی کی تمام تر ہمدردی اس وقت ابّو کے حصّے میں تھی۔ اسی لیے بہت آہستہ لہجے میں ایک طرح سے اُن سے مشورہ بلکہ اجازت لینے کے انداز سے انہوں نے پوچھا تھا۔ اور اسی وجہ سے اب مجھے امید ہوگئی تھی کہ میری خواہش پوری ہوگی۔ جب خواہش پوری ہوتی دکھائی دے تو اُس وقت خوشی کا اندازہ نہ پوچھیے۔ میں خوشی سے کان لگائے سننے لگا۔ ابّو نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ بلّی بہت پیاری لگتی ہے۔ بچّے اور بلّی کا رشتہ تو تم جانتی ہو۔ تم نے بھی بچپن میں بلّی سے پیار کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک رات ایک بلّی تم پر جھپٹ پڑی تھی۔ اور اندھیرے میں تم ڈر گئی

تھیں۔ وہ ڈراب تک تم پر مسلط ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ اب تم بیٹے کی خواہش کو بھی نہ پوری ہونے دو۔ یہ تو نہیں ڈرتا بلّی سے۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارا ڈر دور کرنے کا بھی یہی سب سے اچھا علاج ہے کہ تم اپنے بیٹے کو بلّی پالنے کی اجازت دے دو۔"

میں نے سوچا یہ ابّو نہیں بلکہ زخمی ابّو بول رہے ہیں، جن کے سر پر شر پسندوں نے پتّھر مارا تھا۔ اس زخم سے بہتا ہوا خون امّی ابھی ابھی دیکھ چکی تھیں۔ ابّو کی پیشانی کی پھٹی ہوئی جلد سے بہتا ہوا خون... امّی کچھ نہ بول سکیں۔ ابّو کی زخمی پیشانی پر لگی ہوئی سفید پٹّی سے باہر سُرخ خون کا بہت بڑا دھبہ دیکھتی رہیں۔ اور کچھ نہ بول سکیں۔ تب ابّو نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"پالو بیٹے اپنی لوسی کو پالو۔ لوسی گرے کو۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ آجائے گی ابّو۔ امّی کے ڈر سے میں نے اس کو باہر نکال دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"لوسی! کتنا پیارا نام رکھا ہے تمہارے بیٹے نے! یہ نہیں غور کیا تم نے؟ جانتی ہو لوسی گرے کون تھی؟"

ابّو نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ وہ اچھا لکھتے بھی تھے۔ ان کی گفتگو میں بھی ادب کی نرمی، ٹھنڈک، پیار، محبّت اور خوشبو تھی۔ وہ کالج میں پڑھاتے تھے وہاں کے انگریزی ادب کے طلبا، ہمیشہ ان کے گرد حلقہ بنائے رکھتے تھے۔ ابّو کے دوست ان کی باتوں سے بہت لُطف اندوز ہوتے تھے۔ ابّو کی لکھی ہوئی کہانیوں میں آسمانی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ زمین پر رہنے والوں کو آسمانی مخلوق بنانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے "دیکھو آسمان پر اتنی مخلوق رہتی ہے۔ کبھی کوئی کسی سے نہیں جھگڑتا۔ تم لوگ کیوں بات بات پر لڑتے رہتے ہو۔ ہنسو، مسکراؤ، ہل مِل کر رہو۔" امّی نے سوچنے کے بعد کہا۔

"لیکن میرے سامنے اگر لوسی ٹوسی لائی گئی تو میں اُس کو چولھے میں جھونک دوں گی۔"

"ہاں ہاں! شمّی! اتنا غصّہ نہیں۔ اچھا بھئی! سنو بیٹے! تمہاری لوسی صرف تمہارے کمرے میں رہے گی اور میرے کمرے میں۔ سدھاؤ گے تو اس کو یہ بھی سکھا دینا کہ تمھاری امّی کے کمرے میں نہ جائے باورچی خانے کا رُخ نہ کرے۔ ورنہ سُن لیا نا تم نے۔ وہاں چولھا ہوتا ہے۔ اس میں جھونک دیں گی امّی تمھاری لوسی کو! بھئی انتظام کے معاملے میں دراصل میں کچھ بول ہی نہیں سکتا۔ تمھاری امّی کی انتظامیہ یہی کہتی ہے تو یہی سہی۔" ابّو کہہ کر خاموش ہو گئے۔ امّی کا سر اونچا ہو گیا۔ موقع تاک کے میں نے پوچھا۔

"تو میں لوسی کو لے آؤں امّی؟" میں نے امّی سے پوچھ ہی لیا۔

"بس جو بتایا گیا ہے، اُسی طرح رکھنا۔ ورنہ میں گردن مروڑ دوں گی۔ بتا دیتی ہوں۔"

"کس کی گردن بھئی؟" ابّو نے مسکراتے ہوئے امّی سے پوچھا۔

امّی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس موقعے کو میں ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیتا تھا اور میں دوڑ کر امّی سے لپٹ گیا۔ اور انھوں نے بھینچ کر مجھے پیار کر لیا۔ ماما میں کبھی گرہن نہیں لگتا۔ اس کو کوئی چیز نہیں چھپا سکتی۔ پھر امّی نے کئی بار میرا چہرہ چوما۔ اور جب ابّو سامنے ہوتے تھے تو وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ اور اس وقت تو ابّو کے سر میں چوٹ لگی تھی نا۔

میں دروازہ کھول کر باہر گیا، تو میں نے دیکھا کہ بلّی سائبان میں لیٹی ہوئی ہے اور لوسی کو دودھ پلا رہی ہے۔ میں دور سے ہی اُس کو دیکھتا رہا۔ وہ دودھ پلاتی رہی۔ پھر جب لوسی دودھ پی چکی اور بلّی بیٹھ گئی۔ تو میں اس کے قریب گیا۔ بلّی نے مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ایسی نظریں اعتبار سے بھری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لوسی کو چاٹنے لگی۔ میں نے اس وقت لوسی کو ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا۔

کچھ قیمہ امّی نے پکانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا لے کر میں نے بلّی کو دیا، تو وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ ادھر کھا رہی تھی اور میں لوسی کو پیار کر رہا تھا۔ بلّی چونکہ پہلے ہی لوسی کو پیار کرتے ہوئے مجھے دیکھ چکی تھی اور یہ منظر اُس کے لیے کچھ نیا نہ تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ میں نے اس کو قیمہ کھانے کے لیے دیا تھا اس لیے وہ بالکل خاموش رہی اور میرے اُوپر نہیں جھپٹی۔ وہ قیمہ کھاتی رہی اور میں اپنی لوسی کو پیار کرتا رہا۔

جو بلّی بچپن سے ہی گود میں بیٹھنے لگتی ہے وہ بڑی ہو کر اپنے مالک سے اتنی محبّت کرنے لگتی ہے کہ وہ اس کے اشارے پر اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ مجھے لوسی سے جتنا پیار ہوا اس سے کہیں زیادہ لوسی کو مجھ سے ہو گیا۔ میں اس کو اپنے کمرے میں لے جاتا تھا اپنے ساتھ کھلاتا تھا۔ اپنے ساتھ سلاتا تھا۔ اور میں نے اس کو بڑی محنت سے سکھایا تھا کہ وہ امّی کی طرف یا باورچی خانے میں نہ جائے۔ اس لیے وہ نہ امّی کے کمرے میں جاتی تھی اور نہ باورچی خانے میں۔ اُسے پتا ہی نہیں تھا کدھر ہے کمرہ اور کدھر ہے باورچی خانہ۔ یہی وجہ تھی کہ لوسی کے معاملے میں امّی نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ بلکہ کبھی کبھی تو خود ہی مجھے کہتی تھیں کہ اچھا اب اس کو نکال دو گھر سے باہر۔ کھا پی کر آئے گی۔ اصل میں امّی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ لوسی

گھر سے باہر نہیں، گھر کے اندر کھاتی ہے اور وہی کچھ کھاتی ہے جو میں کھاتا ہوں۔ امی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ روزانہ باورچی خانے سے میں اس کے لیے کھانے کی چیزیں چُپ چاپ امی کی آنکھ بچا کر کے لاتا ہوں۔

بہت دن گزر گئے۔ لُوسی اچھا اچھا کھانا کھا کے بہت بڑی اور خوبصورت بلّی ہو گئی۔ بالکل شیر کے جیسا رنگ تھا اُس کا جس وقت وہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا شیرنی چلی جا رہی ہے۔ امّی بھی اس کو دیکھ کر کبھی کبھی خوش ہوتی تھیں۔ وہ تھی ہی اتنی خوبصورت۔ لیکن اس کو پیار کبھی نہیں کیا امّی نے۔ اور یہ اُن کے بچپن کا خوف تھا جو اب تک اُن پر سوار تھا۔ جس سے وہ اس عمر میں بھی نہیں چھٹکارا پا سکی تھیں۔ البتّہ ابّو ہمیشہ اس کو اسی طرح پیار کرتے تھے جس طرح میں کرتا تھا۔

ایک دن ابّو کے کچھ خاص دوست آنے والے تھے۔ انہوں نے بہت سارا سامان لاکر امّی کو دیا۔ ان میں مچھلیاں بھی تھیں۔ مرغ کا گوشت بھی تھا۔ اور کچھ قیمے اور پسندے۔ امّی سب سامان سنبھال کر باورچی خانے میں رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ لوسی میاؤں میاؤں کر کے کھانے کی ضد کرنے لگی، تو میں اپنی عادت کے مطابق امّی کو غیر حاضر پا کر جلدی سے باورچی خانے میں لوسی کے لیے کچھ لانے گیا۔ اور وہ میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں۔ پھر اُس کو دُودھ دے کر میں اسکول کا ہوم ورک کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد امّی کے چیخنے چلّانے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ہائے ہائے! سارا قیمہ، مچھلی، گوشت یہ بلّی کھا گئی۔ ہائے سب کھا گئی۔"

میں گھبرایا ہوا اپنے کمرے سے باہر آیا تو باورچی خانے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ لوسی نے سب اُلٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اور جانے کتنا نقصان کیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ مگر میں چُپ تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی امّی غصّے میں بولیں۔

"یہ تمہاری لُوسی۔ سب تباہ کر دیا اُس نے۔ میں اس کو ایک منٹ نہیں دیکھنا چاہتی۔ کہاں ہیں تمہارے ابّو۔۔۔" بس آپ ہی آپ وہ بڑبڑاتی ہوئی ابّو کے کمرے میں گئیں۔ ابّو آرام کر رہے تھے۔ امّی چیخ کر بولیں۔

"آپ جتنا گوشت، مچھلی لائے تھے سب کھا گئی لوسی تُوسی۔ میں ایک منٹ کے لیے اس کو گھر

میں نہیں دیکھنا چاہتی - یہ گھر ہے چڑیا گھر نہیں۔ دیکھیے آپ ابھی اُٹھیے، اس کمبخت کو بوری میں بند کیجیے اور لے جا کر جنگل میں پھینک آئیے - میرا خون کھول رہا ہے ...۔"

امّی کا مزاج اس وقت قابو سے باہر تھا - اس لیے ابّو جلدی سے اُٹھے - سیدھے اسٹور میں گئے۔ بوری لی اور لوسی کو پکڑ کر اُس میں ڈال دیا - میں چُپ تھا، لیکن رو رہا تھا - ابّو کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے - لیکن نہ ہم کچھ کہہ سکتے تھے، اور نہ ابّو کچھ کہہ سکتے تھے - کیونکہ ہم لوگ امّی کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف تھے - ان کی بات ایسے موقعے پر نہیں ماننے کا مطلب تھا کہ ان کو بیمار ڈال دیا جائے - اس لیے ہم لوگ بالکل چُپ رہے۔

ابّو نے لوسی کو جب بوری کے اندر ڈال دیا تو لوسی میاؤں میاؤں کر رہی تھی - وہ شاید مدد مانگ رہی تھی - میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا - دوڑ کر امّی کے پاؤں سے لپٹ گیا اور رو رو کر امّی سے کہا کہ لوسی کو جنگل میں نہ پھینکوائیں۔ لیکن انھوں نے میرے گال پر ایک تھپیڑ مار کر کہا "خاموش ہو جاؤ۔"

ابّو اس کو بوری میں لے کر چلے گئے - اور پھر شام کا اندھیرا چھا گیا، لیکن ابّو واپس نہیں آئے تو امّی گھبرانے لگیں - انھوں نے کہا۔

"تمہارے ابّو نہیں آئے بیٹا، شام ہو گئی "

"مجھے کیا پتا۔" میں نے انتہائی غم سے کہا۔ امّی غور سے مجھے دیکھنے لگیں - بولیں۔

"تجھے افسوس ہے نا بیٹے! مگر میں کیا کروں بیٹا، مجھے بہت غصّہ آیا تھا اور میں نے غصّے میں اس کو جنگل میں پھینکوا دیا - مگر میں کیا کر سکتی تھی بیٹا ...!"

"آپ اُس کو باندھ کے رکھ سکتی تھیں - آپ اُس کو پنجرے میں رکھ سکتی تھیں - آپ اُس کو خالہ کے ہاں بھیج سکتی تھیں، لیکن آپ نے اُس کو جنگلی کتّوں کے حوالے کر دیا - میں نے اُس کو کتنی محبت سے پالا تھا ...۔" کہہ کر میں زار و قطار رونے لگا - آنسو تھے کہ رُکتے ہی نہیں تھے - ہچکیاں بندھ گئیں روتے روتے، اور امّی مجھے دشمن نظر آنے لگیں۔

عشأ کا وقت ہو گیا، لیکن ابّو نہیں آئے تو امّی ان کو یاد کر کر کے اور رونے لگیں۔

رات کے بارہ بجے ابّو گھر میں داخل ہوئے - ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ لوسی ابّو کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی - امّی جو ابّو کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی تھی - غصّے سے اُن کا چہرہ پھر تمتمانے لگا - وہ

چیخ کر بولیں۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟ اِس کو پھر اپنے ساتھ لے آئے؟" ابّو نے بڑی بے زاری سے کہا

"نہیں بھٹی! میں نے اس کو بوری سمیت جنگل میں پھینک دیا تھا۔"

"پھر یہ کیسے آپ کے ساتھ آگئی؟" امّی نے پوچھا۔

"یہ خود سے نہیں نکلی۔ مجھے نکالنا پڑا۔" ابّو نے کہا

"ارے واہ! کیوں؟"

"میں اس کو پھینک کر جب واپس آنے لگا، تو میں جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ بھول گیا۔ تب میں نے لومی کو بوری سے نکالا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہُوا جنگل سے باہر نکلا۔ ورنہ میں اندر ہی بھٹکتا رہتا۔ اور جنگلی جانور مجھے کھا چکے ہوتے۔ میرا خیال ہے ہمیں لومی کو پستول سے شوٹ کر دینا چاہیے۔" ابّو نے اطمینان سے کہا۔ اور میرا دل تو دھک سے رہ گیا۔

اور امّی، اُنھوں نے تیزی سے دوڑ کر لومی کو گود میں اُٹھا لیا اور پیار کرنے لگیں۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

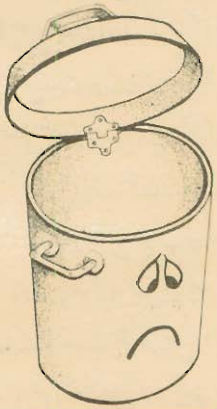

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے تہیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی تہیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک لسٹ" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک لسٹ" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک لسٹ "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

پیٹو خاں کا گیت

مرسلہ:- سیّد وجاہت حسین - لاہور

امّی لحاف چھوڑیئے — جلدی کچن میں آئیے
بھوکا ہوں کتنی دیر سے — چولہا ذرا جلائیے
روٹی ملی تو کیا مزہ — بوٹی مجھے کھلائیے
منہ کا مزہ بگڑ نہ جائے — چائے مجھے پلائیے
پیالی نہ دُوں گا ایک میں — پُورا گھڑا پلائیے
بھائی بہن ہیں تاک میں — دونوں سے کہیئے جائیے

دونوں کو کچھ نہ دیجئے — حلوہ مجھے کھلائیے
آنکھوں میں نیند آگئی — سُستی لبوں پہ چھا گئی
کھیلوں گا پھر اٹھوں گا جب — بستر پہ اب سلائیے

جذبۂ آزادی

بچوں نے ٹینکوں کے منہ موڑ دیئے

عالیہ گل صافی - مردان

۸ نومبر ۱۹۵۶ء کی رات کو بوڈاپسٹ کی ایک ننھی منّی

بچی روسی فوج کے لئے بچوں کی جانب سے پہلا خطرہ ثابت ہوئی۔ اُس نے روسیوں کے ٹینکوں کو دیکھا تو اپنے ہاتھوں میں پکڑی اپنی بدصورت سی گڑیا کو سینے سے چمٹا کر کہنے لگی۔

"الوداع کٹنکا۔ اب تم مجھ سے نہ مل سکو گی"۔ یہ کہہ کر اس نے وہ گڑیا ایک روسی ٹینک کی طرف پھینکی جو اپنی ہیبت ناک آواز کے ساتھ بازار میں گشت کر رہا تھا۔ ایک ہولناک دھماکہ ہوا اور فولادی ٹینک کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ ان میں سے ایک ٹکڑا اس بچی کے گردن میں لگا اور وہ وہیں پر ختم ہوگئی۔ دراصل اس گڑیا میں ایک ننھا سا بم فٹ تھا۔

یوں روسی فوج کے خلاف ہنگری کے افراد کی اس شورش کا آغاز ایک طرح بچوں کی طرف سے ہی ہوا تھا۔

روسی فوجوں کے خلاف جوں جوں ہنگری کے عوام کی نفرت بڑھتی گئی۔ بوڈاپسٹ کے بچے توں توں دیوانہ وار جنگ میں مصروف ہوگئے۔ بچوں سے حوصلہ پاکر نوجوان بھی اس جنگ میں شریک ہوگئے۔

ایک پندرہ سالہ یتیم لڑکے نے اپنی رام کہانی یوں سنائی ہے: "جوں ہی کوئی روسی ٹینک قریب آتا ہم میں سے ایک لڑکا کود کر سامنے آجاتا اور ایک گیلا کمبل اس سوراخ پر پھینک دیتا جسے ڈرائیور استعمال کرتا ہے۔ دوسرا لڑکا ڈھکنے سے چمٹ جاتا۔ تیسرا لڑکا گیلا کمبل ٹینک پر پھیلا دیتا۔ جب روسی ڈھکن اُٹھاتے ہم اُس کے اندر ایک خانہ ساز بم پھینک دیتے۔ میں نے اور میرے چند دوستوں نے اس طرح دس ٹینکوں کو برباد کر دیا۔"

ایک بارہ سالہ لڑکی اپنے جسم سے بم باندھ کر ایک ٹینک کے نیچے لیٹ گئی۔ ۱۴، اور پندرہ سال کی عمر کے بچوں نے چار دنوں تک ایک بازار کی حفاظت کی۔ آخر روسی فوجوں نے اُن کا صفایا کر دیا۔ آج تک کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ بوڈاپسٹ کے بازاروں میں کتنے بچے موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔

اور کتنے سائبیریا بھیجے گئے۔ ان سب میں بہادر ترین چودہ سالہ سینڈور تھا۔ اس کی کہانی اس کے اُستاد نے سنائی جو اس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے "پانچ روسی ٹینک بوڈاپسٹ کے وسیع چوک میں چلے آرہے تھے۔ مقامی باشندے مکانوں کی کھڑکیوں سے پٹرول کے ڈبے پھینک رہے تھے ٹینکوں کی توپیں اور مشین گنیں آگ اُگل رہی تھیں۔"

میں نے سینڈور کو تلاش کرنا چاہا۔ وہ وہاں نہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن سینڈور بازار کے کونے والے بموں کے گودام میں چلا گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے نکلا۔ تو میں گیا دیکھتا ہوں کہ اُس نے چھ بموں والا ایک بنڈل اُٹھا رکھا ہے۔ جب ٹینک قریب آئے تو زمین کانپ اُٹھی۔ ہم انتظار کرنے لگے کہ وہ قریب آئیں تو ہم اُن کی خبر لیں۔ اچانک سینڈور آگے بڑھا۔ اُس نے بموں کے پن نکال دیئے اور انھیں ٹینک کی طرف پھینکا۔ پھر وہ بھاگنے کے لئے پلٹا لیکن وہ بنڈل زمین پر گر گیا تھا۔ سینڈور بم اُٹھانے کے لئے لپکا اور اس نے اُسے اُٹھا کر ٹینک پر پھینک دیا۔ جھک پیدا ہوئی اور ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ سینڈور کے جسم کے پرخچے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔"

ہنگری کے بچوں کی موت رائیگاں نہیں گئی۔ ان کا ملک ایک طویل عرصے کے بعد روس کے تسلط سے آزاد ہوگیا... لیکن ان بچوں نے ثابت کر دیا کہ آزادی کا جذبہ توپوں اور ٹینکوں سے زیادہ طاقتور ہے۔

ثابت ہوا کہ جنگ ہتھیاروں سے زیادہ حوصلے بہادری اور جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ خدا وہ وقت کبھی نہ لائے کہ کبھی ہم بھی خدانخواستہ ہنگری جیسے حالات سے گزریں، لیکن ضرورت آنے پر ہمیں اپنی جان و مال کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ ہنگری کے بچوں کے ساتھ صرف ان کا جذبہ اور حوصلہ تھا۔ لیکن ہمارے پاس اُن کے ساتھ ساتھ ایمان کی طاقت اور خدا کی ذات بھی ہے۔

کچھ باتیں جانوروں کی

محمد ظفر اقبال

۱۔ ذرا سوچ کر بتائیے کہ دنیا میں سائنسدانوں نے سب سے زیادہ تجربات کس جاندار پر کئے ہیں ؟

۲۔ اُس جانور کا نام بتائیے جس کی تین آنکھیں ہوتی ہیں؟

۳۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کبوتروں کی دنیا میں کتنی اقسام پائی جاتی ہیں ؟

۴۔ انسان کے سب سے پہلے پالتو جانور کا نام بتائیے ؟

۵۔ بتائیے کہ چیونٹیاں چلتے چلتے ایک دوسرے کو مس کرتے ہوئے کیوں گزرتی ہیں ؟

۶۔ بتائیے سفید ہاتھی سب سے زیادہ کہاں پائے جاتے ہیں؟

۷۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اونٹ پانی سے بہت ڈرتا ہے ؟

۸۔ دُنیا کا سب سے بڑا جانور کون سا ہے اور عموماً اس کی عمر کتنی ہوتی ہے ؟

۹۔ بتائیے مکھی ایک سیکنڈ میں اپنے پروں کو کتنی دفعہ حرکت دیتی ہے ؟

۱۰۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ہاتھی اور گھوڑے کھڑے کھڑے بھی سو سکتے ہیں ۔؟

۱۱۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بارہ سے اٹھارہ فٹ لمبی دُم والی چڑیا کس ملک میں پائی جاتی ہے ؟

۱۲۔ کیا یہ صحیح ہے کہ دنیا میں کوئی بھی پرندہ سورج کے سامنے نہیں دیکھ سکتا ؟

۱۳۔ اس جانور کا نام بتائیے جس سے شیر بھی ڈرتا ہے ؟

۱۴۔ بتائیے گینڈے کا سینگ کس چیز کا بنا ہوا ہوتا ہے؟

جواب :- (۱) شہد کی مکھی پر (۲) کنگ کریب (۳) تقریباً ۲۷۹ اقسام (۴) کتا (۵) پیغامات دیتی ہیں۔ (۶) سیام (تھائی لینڈ) (۷) جی ہاں (۸) نیل وہیل تقریباً ۵۰۰ سال (۹) تقریباً ۳۰۰ بار (۱۰) جی ہاں (۱۱) جاپان (۱۲) جی ہاں (۱۳) پینگوئین (۱۴) بالوں کا ۔

عجیب پاگل

عامر سلیم راولپنڈی

چند سال پہلے کی بات ہے کہ گلستان کالونی کے ایک چھوٹے سے مکان میں ایک بڑھیا اپنے پاگل بیٹے کے ساتھ رہا کرتی تھی ۔ کالونی بھر میں اس بات کا چرچا تھا کہ فلاں گھر میں ایک پاگل رہتا ہے ۔ مائیں اپنے بچوں کو اس گھر کے قریب جانے سے منع کرتی تھیں ۔ وہ اپنے ننھے منے بچوں کو بڑھیا کے پاگل بیٹے ناصر کا نام لے کر ڈراتی تھیں ۔

ناصر دیوانگی کے اس عالم میں تمام دن اپنی کال کوٹھڑی میں پڑا رہتا ۔ وہ اپنے قید خانے کی سلاخوں میں سے گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا ۔ اس کی ماں جب سلاخوں کے قریب کھانا لے کر آتی تو وہ بے قابو ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دیتا ۔ ماں پیار بھرے لہجے میں کہتی ۔

"بیٹا کھانا کھالو"

ناصر کو تو اپنی خبر نہ تھی اُسے کھانے کا ہوش کیا ہوتا ۔ اسی دیوانگی کے عالم میں وہ کئی بار اپنی ماں کو زخمی کر چکا تھا ۔ وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے ماں کا چہرہ نوچ لیتا ۔ اُسے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر سلاخوں پر دے مارتا تھا ۔

ناصر کے اس طرح زخمی کرنے کے باوجود وہ بلا ناغہ کھانا لے کر سلاخوں کے قریب کھڑی ہو جاتی تھی اور ہر روز

ایک نیا زخم اپنے جسم پر لے کر جاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ گلستان کالونی میں آباد یہ مختصر سا گھرانہ پورے علاقے میں مشہور ہو چکا تھا۔ کالونی والے جہاں ناصر کے پاگل پن کی بات کرتے تھے وہاں اُس کی ماں کے ایثار کا ذکر ضرور کرتے تھے۔

مگر لوگ صرف باتیں کرتے تھے۔ عملی قدم کوئی نہیں اُٹھاتا تھا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ بڑھیا کو اس علاقے سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ لوگوں کی ان آرا کی روشنی میں فیض رحمن نے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان سے پوچھا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ایک شخص اُٹھ کر بولا۔

"فیض رحمان صاحب! یا تو ناصر کا علاج کرایا جائے یا اس کو ہمیشہ کے لیے اس کالونی سے نکال دیا جائے۔"

اگلے روز چھ آدمیوں کا وفد بڑھیا کے دروازے پر موجود تھا۔ طویل بحث کے بعد طے پایا کہ مختے والے بڑھیا کے پاگل بیٹے کا علاج کروائیں گے۔

ذہنی امراض کے ڈاکٹر نے بڑھیا سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ بڑھیا کا بیٹا ناصر قیام پاکستان کے وقت فسادات کے بعض ہولناک مناظر دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے نہایت توجہ سے علاج شروع کیا اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ دنوں بعد بڑھیا کا بیٹا ذہنی طور پر نارمل ہو گیا۔ بڑھیا کا بیٹا پاگل ہونے سے قبل تحریک پاکستان کا سرگرم کارکن تھا۔ بڑھیا کا بیٹا صحت مند ہوا تو اماں نے کہا۔

"میرے بیٹے آج پھر وہ وقت ہے کہ تم پاکستان کی اسی طرح خدمت کرو جس طرح کبھی کیا کرتے تھے۔"

"ہاں ماں میرا بھی یہی خیال ہے۔ بس کل سے میں نوکری تلاش کرتا ہوں تاکہ مناسب انداز میں جینے کا کوئی بندوبست ہو سکے۔" بڑھیا سے ناصر نے کہا۔

چند روز بعد ناصر ایک نوکری کے سلسلہ میں ایک جگہ انٹرویو دینے گیا تو انٹرویو لینے والے نے پوچھا "کیا کوئی سفارش ہے؟" ناصر نے جواب دیا۔

"سر میرے کوائف شاندار ہیں پھر مجھے سفارش کی کیا ضرورت ہے۔" یہ سُن کر افسر بولا۔

"آج کل نوکری قابلیت پر نہیں۔ سفارش پر ملا کرتی ہے۔ اگر کہیں سے سفارش لگوا سکتے ہو تو لگوالو ورنہ سوائے سوری کے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ناصر نے اپنی ماں کے اصرار پر مختلف جگہوں پر نوکری کے لیے کوشش کی۔ مگر وہ جہاں بھی گیا وہاں سب سے پہلے سفارش کے متعلق پوچھا گیا۔ وہ بہت دنوں تک دردر کی خاک چھانتا رہا۔ وہ ہر شام کو بیتے ہوئے دن کے تلخ واقعات کو اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیتا تھا۔

ایک دن نوکری کی تلاش میں اس کا گزر ایک لڑکوں کے کالج کے آگے سے ہوا تو وہ نوجوان نسل کو دیکھ کر لرز گیا کیونکہ ان کی وضع قطع عجیب و غریب تھی۔ لمبے لمبے بال، گریبان کھلے ہوئے تنگ پتلون اور ہاتھ میں ایک نائش فائل لے کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جا رہے تھے۔ ان طالبعلموں کو دیکھ کر ناصر کو محسوس ہوا کہ یہ ان سمتوں میں سفر کر رہے ہیں جن کے آخر میں خوفناک گڑھے ہیں۔ اگر نوجوان نسل نے اپنے راستے کو نہ بدلا تو وہ ایک دن ان گڑھوں میں گر کر اپنی موت مر جائے گی۔

شام کو جب وہ اپنی ڈائری میں گزرے ہوئے واقعات لکھ رہا تھا تو اُس کی ماں نے پوچھا "بیٹا! کیا لکھ رہے ہو؟" ناصر نے قلم روک کر جواب دیا۔

"ماں ماں میرے دنوں کو ان صفحات پر رقم کر رہا ہوں تاکہ میرے دوبارہ پاگل ہونے کی وجہ معلوم ہو جائے۔"

ناصر کے منہ سے دوبارہ پاگل ہونے والی بات بے اختیاری کے عالم میں نکل گئی تھی۔ مگر ایک دن کالونی والوں کو پتا چلا کہ ناصر دوبارہ پاگل ہو گیا ہے۔

ناصر نے اپنی کوٹھڑی کو پھر آباد کر لیا تھا۔ لوگ آتے اور افسوس کرتے ہوئے بڑھیا سے ناصر کے دوبارہ پاگل ہونے کی وجہ پوچھتے مگر بڑھیا خاموش رہتی۔

ایک دن بڑھیا کو بیٹھے بیٹھے اچانک ناصر کی ڈائری کا خیال آیا اُس نے فوراً ڈائری تلاش کر کے اس کی ورق گردانی کی تو صفحہ نمبر ایک سے لے کر صفحہ نمبر ۱۵ تک پھیلی ہوئی پندرہ دنوں کی داستان پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ مجھے پڑھو اور پھر اس میں اپنا عکس دیکھو۔

پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔

"اس ہوش مندی کی دنیا میں واپس آنے کے بعد نوکری کے لیے جدوجہد کی تو معلوم ہوا۔ یہاں صرف سفارش کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس موقع پر میں نے دیکھا کہ قائداعظمؒ کے اس فرمان کی نافرمانی ہو رہی تھی"

"ایمانداری اور خلوص دل سے کام کیجئے۔ کام اور کام۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ضمیر سے بڑی قوت روئے زمین پر نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں جب آپ خدا کے روبرو پیش ہوں تو پورے اعتماد سے کہہ سکیں کہ میں نے اپنا فرض انتہائی ایمانداری وفاداری اور سچی لگن سے انجام دیا ہے" (فروری ۱۹۴۸ء)

قائداعظم کے اس فرمان کی نافرمانی دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رویا میں نے سوچا کیا پاکستان ان بے ایمانی کے لئے حاصل کیا گیا تھا؟ کیا پاکستان انہیں کاموں کے لیئے وجود میں آیا تھا۔؟

ڈائری کے اگلے صفحے پر لکھا تھا تھا۔

آج ایک کالج کے طالب علموں کو دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا۔ لڑکوں نے تعلیم اور اخلاق سے زیادہ اپنی جسمانی آرائش پر توجہ دی ہوئی تھی۔ یہاں میں نے قائداعظمؒ کے اس فرمان کی نافرمانی دیکھی۔

"پاکستان کو اپنے جوانوں اور بالخصوص طلبہ پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صف اوّل میں رہے ہیں۔ آپ مستقبل کے معمار ہیں اس لئے جو مشکل کام آپ کے سر پر آپڑا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لئے اپنی شخصیت میں نظم وضبط پیدا کریں۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کریں۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

(۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو طلبہ کے ایک وفد سے خطاب)

میں نے ۱۹۴۷ء کو آگ کا دریا عبور کر کے جس پاکستان میں قدم رکھا تھا۔ وہ تو محبتوں کا گہوارہ تھا۔ اور آج ہر طرف خودغرضی کے تناور درخت کھڑے ہیں جن پر رشوت سفارش اور بددیانتی جیسے پھل لگ رہے ہیں۔ میں تو وہ پاکستان چاہتا ہوں جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔

ڈائری کے باقی صفحات کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر مفت کی چیز مل جائے تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ نوجوان نسل کو پاکستان مفت میں ملا ہے۔ اس نسل نے جب پہلی بار سانس لیا تو آزاد فضاؤں میں، پہلی بار آنکھ کھولی۔ آزاد وطن میں، جب پہلی بار چہل قدمی کی تو آزاد دھرتی پر۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ وطن پاکستان کن کن مشکلات کو سہہ کر حاصل کیا گیا تھا۔

"آج اگر قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ اپنی قبروں سے اُٹھ کر موجودہ پاکستان کو دیکھیں تو وہ بھی اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکیں گے۔ وہ بھی میری طرح دیوانے ہو جائیں گے۔ مجھے لگتا ہے میں بہت جلد دوبارہ پاگل ہو جاؤں گا"

اس کے بعد ناصر کی شہرت مزید پھیل گئی۔ مگر اُسے لوگ اب محض پاگل نہیں کہتے تھے بلکہ ہر شخص اب اُسے ایک دوسرے نام سے جانتا تھا "عجیب پاگل" کے نام سے۔

آمر سے نجات

مرسلہ:۔ سمکان مغل۔ شکارپور

سوئٹزرلینڈ کی کہانی

بہت پرانی بات ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے

خوبصورت ملک پر گیسلر نامی ایک شخص کی حکمرانی تھی۔ یہ شخص انتہائی ظالم اور مکار تھا۔ روز انہ نئے نئے قانون بناتا۔ ایسے قانون جن پر عمل کرنا سخت مشکل ہوتا۔ لیکن لوگوں کو ان پر عمل کرنا پڑتا۔ ورنہ یہ ظالم سخت سزائیں دیتا تھا۔ اس کی زبان ہی اُس کا قانون تھی۔ ایسے ہی حاکم کو آمر کہا جاتا ہے۔

اس زمانے میں سوئٹزرلینڈ کے سرسبز پہاڑوں میں ایک شخص رہتا تھا۔ اس کا نام ولیم ٹیل تھا۔

یہ اپنے زمانے کا مشہور شکاری تھا۔ اور نشانہ بازی میں اپنی مہارت کی وجہ سے پورے ملک میں مشہور تھا۔ لیکن ولیم ٹیل جنگلوں کا شیدائی تھا۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں میں اس کی زندگی گزری تھی، اس لئے وہ نڈر اور بے خوف تھا۔ ولیم ٹیل کی بیوی مرچکی تھی۔ اس کا صرف ایک لڑکا تھا۔ کبھی وہ اپنے لڑکے کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے لڑکے کی بھی تربیت کر رہا تھا۔ لڑکا بھی بہادر اور نڈر تھا۔

چونکہ ولیم ٹیل کا شہری زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لئے اُسے جانتے تو سب تھے لیکن پہچانتا کوئی نہ تھا۔ ہاں البتہ وہ کبھی کبھی شہر آیا کرتا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اپنے لڑکے کو ساتھ لے کر کسی کام کی غرض سے شہر گیا۔ اُس نے دیکھا کہ شہر کے بڑے چوک میں لوگوں کا ہجوم لگا ہے۔ کوئی چیخ چلا رہا ہے، کوئی بڑبڑا رہا ہے۔ اور کسی نے ایسا منہ بنا رکھا تھا جیسے اُسے زبردستی کونین پلا دی گئی ہو۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے بڑھ کر ایک شہری سے پوچھا۔

"بات کیا ہوتی" اس شخص نے جھلا کر جواب دیا "وہی گیسلر کی حماقتیں۔ گیسلر نے یہاں چوک میں ایک کھمبے پر اپنی ٹوپی ٹانگ دی ہے اور اب ہدایت کی گئی ہے کہ جو کوئی اُدھر سے گزرے اس ٹوپی کے احترام میں سر جھکائے۔ یا کسی دوسرے انداز میں عقیدت کا اظہار کرے۔ ایسا نہ کرنے والے کو سزائے موت دی جائے گی۔"

"ہاں یہ تو کھلی حماقت ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنی چاہئے" ٹیل نے کہا اور اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اس کھمبے کی طرف

بڑھا جس پر ٹوپی ٹانگی گئی تھی۔ وہ سر اُٹھا کر قہقہہ لگاتا ہوا کھمبے کے پاس سے گزرا۔

شہر میں بھلا کس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ اس طرح گیسلر کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ شاہی ہرکارے حیران رہ گئے اور گیسلر کو اطلاع دی کہ ایک شخص جس کا نام ولیم ٹیل بتایا جاتا ہے کھمبے کے پاس سے گزرا اُس نے نہ صرف یہ کہ احترام کا اظہار نہیں کیا بلکہ حقارت کے ساتھ قہقہہ بھی لگایا۔

یہ سنتے ہی گیسلر کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً چوک پر پہنچا اُس نے دیکھا کہ لوگ ولیم ٹیل کے گرد جمع ہیں اور اُسے اُس کی جرأت پر مبارک باد دے رہے ہیں۔ شاہی سواری کو دیکھتے ہی بھیڑ چھٹنا شروع ہو گئی۔ عورتیں دل ہی دل میں ٹیل کی سلامتی کی دُعائیں کرنے لگیں۔

"کیا تم وہی ولیم ٹیل ہو جو اپنی نشانہ بازی کی وجہ سے مشہور ہے" گیسلر نے ٹیل کے قریب گھوڑا لا کر پوچھا۔

"جی ہاں وہی ولیم ٹیل۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ میں چھوٹی سی چھوٹی چیز کا نشانہ لے سکتا ہوں" ولیم ٹیل نے انتہائی اطمینان سے کہا۔

"اچھا، ابھی ہم تمہارا امتحان کئے لیتے ہیں اگر تم اپنے دعوے میں سچے ثابت نہ ہو سکے تو تمہیں عبرت ناک سزا دی جائے گی۔"

یہ کہہ کر گیسلر قریب بیٹھی ہوئی اس بوڑھی عورت کی طرف بڑھا جو ایک ٹوکری میں سیب لئے بیٹھی تھی۔ اس ہنگامے کی وجہ سے آج اُس کی بکری نہ ہو سکی تھی۔ اُس نے ٹوکری میں سے ایک سیب اُٹھایا اور ٹیل کے لڑکے کو آواز دی۔ اُسے ایک طرف کھڑا کر کے گیسلر نے ٹیل سے کہا "میں یہ سیب تمہارے لڑکے کے سر پر رکھ رہا

ہوں تمہیں اس طرح نشانہ لگانا ہے کہ سیب دو ٹکڑے ہو جائے اور اس کا خیال رکھنا کہ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو تمہیں ایسی سزا دی جائے گی جسے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔"

لڑکے کو ٹاؤن ہال کے دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور گیسلر نے اس کے سر پر سیب رکھ دیا۔ ولیم ٹیل نے اطمینان سے تیر کمان میں رکھا، نشانہ باندھا اور لڑکے سے کہا "بیٹا ڈرنا مت سر کو سیدھا رکھنا۔ لڑکا ولیم ٹیل کا بیٹا تھا۔ شکار میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور سانس روک کر کھڑا ہو گیا۔ ولیم ٹیل نے تیر چلایا لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں مگر جب آنکھیں کھلیں تو مجمعے نے دیکھا کہ سیب کے دو ٹکڑے لڑکے کے ادھر اُدھر پڑے تھے۔ اب تو واہ واہ کے نعرے لگنے لگے۔ گیسلر کا منہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اُس نے کھسیانا ہو کر ٹیل سے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہارا نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے مگر تمہیں خود بھی اپنے آپ پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ کہ تم نے دوسرا تیر بھی تیار رکھا تھا کہ اگر پہلی بار نشانہ خطا جائے تو تم فوراً دوسرا تیر آزماؤ۔"

"نہیں حضور یہ بات نہیں تھی۔ دوسرا تیر اس لئے تھا کہ اگر خدانخواستہ میرا نشانہ خطا ہو جاتا تو دوسرا تیر آپ کے سینے میں پیوست ہوتا۔" ٹیل نے کہا۔

گیسلر اس گستاخی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

اُس نے حکم دیا کہ ولیم ٹیل اور اس کے لڑکے کی مشکیں کس دی جائیں اور انہیں شاہی قلعے کے جیل خانے میں ڈال دیا جائے۔ سپاہیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ولیم ٹیل اور اس کا لڑکا قید کر دیئے گئے۔

ٹیل ان لوگوں سے نہیں تھا جو ظلم کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ ایک روز رات میں اُس نے بیٹے کو پیٹھ پر لادا۔ اور شاہی قید خانے سے فرار ہو گیا۔ وہ پہاڑ کی بلندیوں پر برف پوشش چٹانوں کے درمیان اپنے لکڑی کے چھوٹے سے گھر میں جا چھپا وہیں سے اُس نے پیغام رسانی کی اور پھر دلیر لوگوں کو ساتھ لے کر ایک روزہ پہاڑوں سے نیچے اُترا۔ گیسلر اور اس کے سپاہیوں سے خون ریز جنگ ہوئی، لیکن باطل حق کے سامنے کبھی ٹھہر نہیں سکتا۔ وہی سپاہی جو نہتوں پر ظلم کرنے کے معاملے میں بڑے دلیر تھے۔ آج پیٹھ دکھا گئے۔ وہی جو کل تک گیسلر کے بے دام غلام تھے اور اس پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار تھے۔ آج اُسے تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گیسلر کو شکست ہوئی اور سوئٹزرلینڈ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس ظلم و ستم سے نجات مل گئی۔

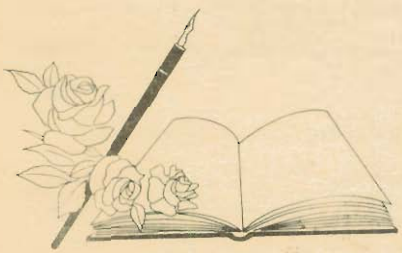

میں یہ سوچتی ہوں

مرسلہ :- عافیہ قمر، کراچی

میں یہ سوچتی ہوں کمشنر بنوں
کبھی سوچتی ہوں کہ شاعر بنوں
مرا کام ہر اک بھلائی کا ہو
بھلائی کا ہو پارسائی کا ہو
کبھی سوچتی ہوں کتابیں لکھوں
کہانی لکھوں اور رسالے میں دوں
کبھی سوچتی ہوں کہ خدمت کروں
میں مجبور لوگوں کی راحت بنوں
اگر بن گئی ڈاکٹر میں کبھی !
غریبوں کے بے حد میں کام آؤں گی

ایڈیسن

غلام حسین مبین۔ حیدرآباد

کامیابی کسی کی میراث نہیں، چراغ اندھیرے میں ہی جلتے ہیں، اندھیرے گھر میں پیدا ہونے والا ایڈیسن جس نے اپنی مسلسل محنت سے ساری دنیا کو روشن کیا۔

بجلی کا ایک ننھا سا بلب ایک بڑے گھر کو روشن کر دیتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اس بلب کا موجد کون ہے۔ جی ہاں بالکل صحیح بوجھا آپ نے۔ اس کے موجد کا نام ٹامس الوا ایڈیسن ہے جو گراموفون اور سینما فلم کا بھی موجد ہے۔

ایڈیسن بڑا موجد تھا اور سب سے زیادہ ایجادات اسی کے نام سے منسوب ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایڈیسن کو اتنی بڑی کامیابی اور شہرت بیٹھے بیٹھے کس طرح مل گئی۔

شہرت اور کامیابی کسی کی میراث نہیں، مسلسل محنت اور لگن کے ساتھ ہی اُسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ۱۱ فروری ۱۸۴۷ء کو امریکہ کی ریاست اوہیو کے قصبے میلان میں پیدا ہونے والا غریب ماں کا یہ بچہ انتہائی ذہین تھا۔ مگر غربت کی وجہ سے وہ اسکول نہ جاسکا۔ اور گھر پر تعلیم حاصل کرنے لگا۔ کچھ بڑا ہُوا تو گھر کی قلیل آمدنی بڑھانے کے لئے مزدوری ڈھونڈنے نکلا۔ اُسے ریل گاڑیوں میں اخبار بیچنے کا کام مل گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اخبار چھاپنے کی مشین خرید لی اور ریل کے ڈبے میں اخبار چھاپنے اور بیچنے لگا۔ اُسی ڈبے کے ایک کونے میں اُس نے سائنسی تجربات کی چیزیں رکھی تھیں۔ اُسے بچپن سے ہی سائنس سے بڑی دلچسپی تھی۔

ایک دن تجربہ کرتے کرتے اُس سے فاسفورس بھڑک اُٹھا اور ڈبے میں آگ لگ گئی۔ گارڈ کو غصہ آیا اور اس نے ایڈیسن کا سامان باہر پھینک دیا۔ اور اُس کے کان پر اتنے زور کا تھپڑ مارا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک کان سے بہرا ہو گیا۔ مگر پھر بھی اُس نے سائنس کا پیچھا نہ چھوڑا اور مسلسل تجربات میں لگا رہا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ مسلسل محنت ہی کامیابی کی راہ دکھاتی ہے۔ وہ ان چھوٹی موٹی غلطیوں سے بددل نہ ہوتا تھا۔ بلکہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ اور تجربے سے علم حاصل ہوتا ہے"۔

اب وہ اسٹیشن پر اخبار بیچا کرتا کیونکہ ڈبے میں اُس کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔ ایک روز اخبار بیچتے بیچتے اُس نے دیکھا کہ ایک ڈبہ آپ ہی آپ لڑھکتے ہوئے آرہا ہے۔ اور اسٹیشن ماسٹر کی بچی اُس پٹری پر کھیل رہی ہے ایڈیسن تیر کی طرح دوڑا اور بچی کو اُٹھا کر پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا۔ اس واقع کے بعد اسٹیشن ماسٹر نے اس پر رحم کھا کر ٹیلی گرافی کا کام سکھا دیا۔ اور ریلوے میں نوکری دلوادی۔ اب وہ تجربات میں اور بھی زیادہ انہماک سے توجہ دینے لگا اور کئی روز کی محنت کے بعد اُس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا جو خود بخود سگنل بھیج دیا کرتا تھا۔ اور وہ آرام سے سوتا رہتا اسی دوران اُس نے ووٹ گننے والی مشین اور ٹیپ مشین بھی بنائی۔ اس کے بعد ملازمت چھوڑ کر وہ نیویارک آگیا مگر ملازمت نہ ملی اور وہ سارا سارا دن گھوما کرتا۔ ایک دن ایک کمپنی کے دفتر جا نکلا۔ یہ کمپنی ایک مشین کے ذریعے اپنے گاہکوں کو منڈیوں کے بھاؤ بھیجا کرتی تھی۔ یہ مشین کئی دنوں سے خراب تھی۔ ایڈیسن نے اُسے چند منٹوں میں ٹھیک کر دیا۔ کمپنی کا مالک بہت خوش ہُوا اور اُس نے ایڈیسن کو مشین کا مینیجر مقرر کر دیا۔ اس ملازمت کے دوران اُس نے ایک انجنیئر کے ساتھ مل کر برقی تار کی ایک نئی مشین بنائی جس نے اس کی شہرت اور دولت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اسی دولت سے اُس نے ایک کارخانہ قائم کیا اور ٹیپ مشین بنانے لگا۔

گراہم بیل کے تیار کردہ ٹیلی فون میں آواز صاف نہیں آتی تھی۔ اُس نے اس میں خرابیاں دُور کر کے آواز کو صاف کیا۔ ۱۸۷۶ء میں اُس نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جس نے ساری دُنیا کو حیران کر دیا۔ یہ مشین فونوگراف PHONO GRAPH تھی۔ ۱۸۷۹ء میں اُس نے بجلی کا بلب ایجاد

کر کے گھروں، صنعتوں اور دفتر وغیرہ کے لئے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ شروع شروع میں ان بلبوں کو نیویارک کی سڑکوں پر بطورِ نمائش لگایا گیا تو دُور دُور سے لوگ اس کی روشنی دیکھنے آتے۔ اس کے دو سال بعد اُس نے اپنی خداداد . . . صلاحیتوں اور مسلسل جدّ وجہد کی بنا پر دُنیا کا پہلا کیمرہ ایجاد کیا۔ جس سے آج ہم مختلف تصاویر اور سینما پر چلتی پھرتی فلمیں دیکھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ مشین جسے کینٹوگراف کا نام دیا گیا صرف تصاویر کو محفوظ کرتی تھی۔ اس کے بعد ایڈیسن نے کینٹواسکوپ ایجاد کیا جس سے تصاویر پردے پر دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کے بعد اس نے اس کے ساتھ فونوگراف بھی لگا دیا۔ جس سے تصاویر چلنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران اُس نے اپنی ملک کی فوج کے لئے چالیس کے قریب ایجادیں کیں جن سے جنگ میں بہت فائدہ ہوا۔ بالآخر ایک ہزار سے زیادہ ایجادات کرنے والا یہ دنیا کا بہت بڑا موجد ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۱ء میں انتقال کر گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایڈیسن کی تمام تر کامیابی اور شہرت مسلسل محنت ہی کی وجہ سے تھی ورنہ تو بچپن میں اُس نے غربت کے دن گزارے تھے۔ ۲، گھنٹے لگاتار کام کرنے کے بعد اُس نے فونوگراف ایجاد کیا تھا۔ جب ایڈیسن کام میں لگ جاتا تو اُسے نہ کھانے کا ہوش رہتا نہ سونے کا۔ ایڈیسن دُھن اور ارادے کا پکّا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو یہ بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

ہمسائے کے حقوق

یوسف شاکر نصراللہ ۔ کراچی

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں قریبی ہمسایہ اور دُور کے ہمسایہ، دونوں کے ساتھ مروّت اور نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور رسولؐ نے اس حکم کی بہت سے موقعوں پر مختلف طریقوں سے تشریح فرمائی ہے آپؐ نے فرمایا کہ۔ "وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھُوکا رہے۔"

پہیلی

سید جاوید حیدر شاہ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

بوجھو میری ایک پہیلی
جو ایجاد ہے اک البیلی
ننّھا سا اک آلہ ہے وہ
آفت کا پرکالہ ہے وہ
ہم تم جاگیں یا پھر سوئیں
اپنے وقت کو یوں ہی کھوئیں
لیکن وہ اِک پل ہو غافل
ایسی نہیں وہ سُست اور کاہل
دن ہو، رات ہو کوئی پل ہو
آج ہو، پرسوں ہو یا کل ہو
جو بھی سب سے پہلے جانے
اُس کو دیں گے ہم چار آنے

(گھڑی)

عجیب وغریب ستارہ

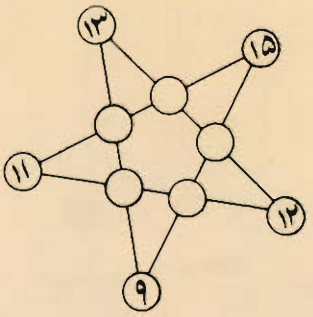

"اس ستارے میں ۱ سے ۵ تک اس طرح ہندسے بھریں کہ لائن میں چاروں خانوں کا مجموعہ ۳۰ ہو"

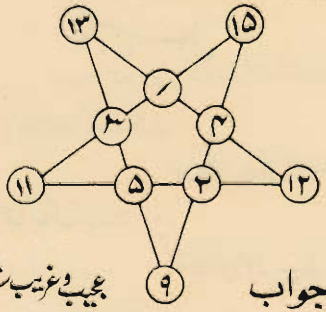

جواب عجیب وغریب ستارہ

کھانے پینے کے آداب

ریاض احمد آرائیں۔غریب آباد دادو

اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو حلال کھانے حلال پینے کا حکم دیا ہے اور حرام کھانے سے پرہیز کا حکم دیا ہے۔ اللہ نے جو چیزیں حلال کردیں وہ انسان کی جسمانی اور روحانی صحت کے لئے مفید ہیں۔ اور جن چیزوں کو حرام قرار دے دیا۔ انسان کی جسمانی اور روحانی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

"اے لوگو! ان چیزوں میں سے کھاؤ جو زمین پر حلال پاکیزہ ہیں (البقرہ ۱۶۸)

اسلام نے کھانے پینے کے آداب، اوقات اور انداز بتائے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام نے اس پر عمل کیا سب سے خوش نصیب وہ ہے کہ جو ساری مخلوق میں سب سے بہتر اور سب سے اچھی سیرت کے مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی اطاعت کرے۔

انسان کو چاہیے کہ کھانا کھاتے وقت جوتے اُتارے تاکہ طبیعت پر بوجھ نہ رہے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کھانا رکھا جائے تو اپنے جوتے اُتار دو۔ یہ تمہارے قدموں کے لئے زیادہ راحت کی بات ہے۔

جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو بسم اللہ کہے پس اگر شروع میں بھول جائے تو (جب یاد آئے) یہ کہے بِسْمِ اللّٰهِ فِیْ اَوَّلِهٖ وَاٰخِرِهٖ (اس کے آغاز و انجام پر اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں)

جب کھانا کھائے تو درمیان میں سے نہ کھائے بلکہ اطراف میں سے کھائے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے پس اس کے اطراف میں سے کھاؤ۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے پس اس کے اطراف میں سے کھاؤ اور اس کے درمیان میں سے نہ کھاؤ (جامع الترمذی: باب الطعام)

مسلمانوں کو مل جُل کر کھانے کا حکم دیا گیا۔ ایک روایت میں صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں مگر سیر نہیں ہوتے۔ آپؐ نے فرمایا "شاید تم جُدا جُدا کھاتے ہو" انہوں نے کہا "ہاں" آپؐ نے فرمایا۔ کھانے پر جمع ہو کر کھاؤ اور اس پر اللہ کا نام لو۔ تمہارے لئے اس میں برکت ہوگی"

نقل شدہ، طویل
اور غیر معیاری تحریریں
شائع نہ ہو سکیں گی۔

جو تحریر آپ ہمیں بھجوئیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ
نہ کریں۔

اپنی نگارشات
صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر
لکھیں۔

سیدھا بیٹھ کر کھانا اور تکیہ لگا کر کھانا متکبرین کا کام ہے۔ بعض لوگ ذرا ذرا سی بات پر کھانے پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ عادت اچھی نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر چاہا تو کھا لیا اگر ناپسند کیا تو چھوڑ دیا۔ (صحیح البخاری، کتاب الاطعمہ)

عجمی لوگوں کی طرح میز کرسی بچھا کر کانٹے سے کھانا بھی ناپسندیدہ کام ہے۔ مناسب یہ ہے کہ زمین پر بیٹھے اور کپڑا بچھا کر اس پر کھانا رکھے اور دائیں ہاتھ سے کھائے۔

انسان کو چاہیے کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے دائیں ہاتھ کے ساتھ کھانا کھائے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی پیتے وقت تین وقفے کرتے تھے اور فرماتے یہ خوب سیراب کرتا ہے، خوب امراض و تکلیف سے بچاتا ہے اور خوب خوش گوار طریقہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں سانس لینے یا اس میں پھونکیں مارنے سے منع فرمایا (جامع الترمذی)

کھلے برتن یا گلاس وغیرہ سے پانی پینا چاہیئے ایسا برتن کہ جو بند ہو یا مشکیزہ ہو یا نل کے ساتھ منہ لگا کر پانی پینا خطرناک ہے۔ کیا خبر کوئی کیڑا وغیرہ اندر چلا جائے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی کھائے تو اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پیئے تو دائیں کے ساتھ پیئے۔ کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ کے ساتھ کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ کے ساتھ پیتا ہے۔

جو لوگ کھانا کھاتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتے وہ شیطان کے ہم نشین ہوتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ شیطان اُس کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھ لیتا ہے (یعنی اس میں شریک ہو جاتا ہے) جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کھانے وغیرہ میں فضول خرچی بھی ناپسندیدہ عادت ہے۔

کھانا پکائے تو پڑوسیوں کا لحاظ رکھے۔ اور ہو سکے تو انہیں بھی کھانے میں شریک کرے۔ چاہیے کبھی کبھی ایسا کرے

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم شوربا بناؤ تو پانی زیادہ کر دو اور اس میں سے پڑوسیوں کے لئے بھی ایک چلّو اٹھاؤ (یعنی انہیں بھی سالن دو) (سنن ابن ماجہ)

جب تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اُسے اُٹھا لے اور اس کے ساتھ لگنے والی خرابی کو دُور کر دے اور اُسے کھا لے۔ اُسے شیطان کے لئے نہ چھوڑے اور جب تک

انگلیاں چاٹ نہ لے تب تک رومال کے ساتھ صاف نہ کرے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے ۔

رات کو کھانے کا ناغہ نہ کرے ۔ چاہے تھوڑی سی ہی غذا کھائے کیونکہ رات کا کھانا ترک کر دینے سے بڑھاپا جلد آجاتا ہے ۔

سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھائیے ۔ یہ دنیا دار متکبرین کا طریقہ ہے ۔ اگر اتفاقاً کھانا سامنے آجائے اور اس وقت نماز بھی کھڑی ہو جائے ۔ تو پہلے کھانا کھالے پھر نماز پڑھے ۔ بشرطیکہ نماز کا وقت باقی رہے ۔ تاکہ نماز کی حالت میں کھانے کی باتیں نہ سوچتا رہے ۔

حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا لائے تو اُسے بٹھائے یا اُس سے اُسے کچھ دے دے ۔ (سنن ابنِ ماجہ)

اگر ضرورت پڑے تو مسجد میں کھانا کھا سکتے ہیں البتہ مسجد کی صفائی کا دھیان رکھنا ضروری ہے ۔ اگر کھانا برتن میں رہ جائے اور وہ اس قدر قلیل ہو کہ اُسے کھانے میں حرج نہ ہو تو اُسے کھا کر برتن صاف کر دے ۔

تین انگلیوں کے ساتھ کھانا کھانا زیادہ مناسب ہے سارا ہاتھ استعمال کرنا کچھ اچھی عادت نہیں ۔ کھانے کے بعد ہاتھ صاف کرے

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے ۔ ہم اس میں منہ لگا کر پینے لگے جناب رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ۔ منہ لگا کر نہ پیئو ۔ اپنے ہاتھوں کو دھو لو پھر ان کے ساتھ پیئو ۔ ہاتھ سے زیادہ پاکیزہ کوئی برتن نہیں ہے

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا کہ آدمی کھڑے ہو کر پیئے ۔ ۔ پوچھا گیا: "پھر کھڑے ہو کر کھانا کیسا ہے؟ فرمایا ۔ یہ اس سے بھی زیادہ سخت (یعنی غلط کام ہے ۔ البتہ زم زم کا پانی کھڑے ہو کر پینا بہتر ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی کیا اور بہتر وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کریں ۔

نظم

مرسلہ :- وحید احمد تبسم، چکوال

ننھے ہو تم تارے ہو تم
پاک وطن کے پیارے ہو تم

سب کے راج دلارے ہو تم
پاک وطن کے پیارے ہو تم

علم کی دولت کو اپناؤ
باطل کا ہر نقش مٹاؤ

پاک وطن کے گیت سناؤ
پاک وطن کے پیارے بچو

اُٹھو اب دشمن کو مٹا دو
سارا وطن گلزار بنا دو

خوشیوں کے پیغام سنا دو
پاک وطن کے پیارے بچو

بلیک بکس

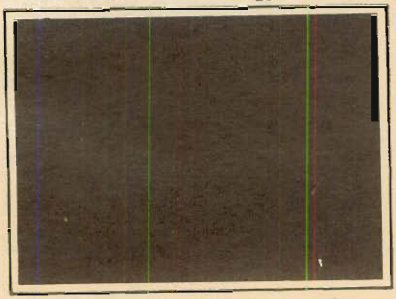

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے "

سالگرہ کے ساتھی

مارچ کے مہینے میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

محمد مبین عزمی۔ (معلوم نہیں)
یکم مارچ ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی کرنا۔ رسائل میں
لکھنا، دینیات، انگلش، کمانڈو، کیپٹن۔ پی کی نمبر ۵۰۵۰،
۲۹۰/۲۸ فیز نمبر۲۔ عمار یاسر ہاؤسنگ سوسائٹی ملیر کراچی

عبدالقدوس مقدسی، ششم
یکم مارچ ۱۹۷۸ء
پڑھنا، لکھنا، دینیات
ڈاکٹر۔
حاجی محمود دکاندار جیوانی (مکران)

راجیش کمار، ہفتم
یکم مارچ ۱۹۷۶ء
کتابیں پڑھنا، انگلش
ڈاکٹر
راجیش کمار، ڈاکخانہ میانہ پتانی ضلع سکھر

امجد حسین ثانی، ہشتم
۲، مارچ ۱۹۷۵ء
قرآن حافظ، عربی
اُستاد
زاہد میڈیکل اسٹور لانڈھی، کراچی نمبر ۲۲ گل احمد ملز

آصف رفیق کامران، ہشتم
۳، مارچ ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، مطالعہ کرنا
سائنس، اچھا پاکستانی
آصف رفیق کامران ۳۔۹/۴۹ ج منظور کالونی کراچی ۴۴

شاہد اقبال خان، نہم
۳، مارچ ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا، اُردو
پائلٹ بننا۔
محمود سٹوڈیو مین بازار پنڈی۔ بھٹیاں

شوکت نوناری، دہم بی
۴، مارچ ۱۹۷۴ء
آئے ہوئے ہر خط کا جواب
دینا، سائنس، اُستاد۔

امجد علی خان، نہم
۴، مارچ ۱۹۷۹ء
پڑھائی کرنا، مطالعہ کرنا
گاؤں یا ڈاکخانہ بریکوٹ گورنمنٹ

محمد عرفان خان آفریدی، کے جی
۵، مارچ ۱۹۸۵ء
کرکٹ کھیلنا، انگلش
ڈاکٹر بنیں گے۔
مکان نمبر ۹۱۷، گلی نمبر ۲

معرفت مری مسجد بھر یارود ضلع نوشہرہ فیروز

نظام الدین صدیقی، دہم
۷، مارچ ۱۹۷۳ء
تن سازی، کرکٹ کھیلنا
ریاضی، فوجی۔

ہائی اسکول، بریکوٹ ضلع سوات

سید مبین واحد شیرازی، دہم
۸، مارچ ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا
حساب، ڈاکٹر

سی بلاک شیر شاہ کالونی کراچی نمبر ۲۸

محمد انور سعید، دہم
۱۰، مارچ ۱۹۷۲ء
بیڈمنٹن، ناول، افسانہ
لکھنا، اُردو، ادیب، نگران تنظیم

مکان نمبر ایچ ۶۱۵ ،بروری روڈ کوئٹہ بلوچستان

محمد معین محمد یٰسین، نہم الف
۱۲، مارچ ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، کیمسٹری،
انجینئر۔ گورنمنٹ کچہری

محلہ بگی پورہ ڈنگہ تحصیل کھاریاں ضلع گجرات

محمد حنیف خان، دہم
۱۱، مارچ ۱۹۷۲ء
ٹکٹ جمع کرنا، مصوری کرنا
اُردو۔ مصور بننا

انکار جوانان چک نمبر $\frac{5.1}{9.2}$ ڈاکخانہ ۱۲۹/۹۔L ساہیوال

شوکت علی بلوچ، دہم
مارچ ۱۹۷۳ء
دوستی مطالعہ کرنا، فٹبال
کھیلنا۔ انگلش، پائیلٹ۔

بمبینو ہائی اسکول کورنگی نمبر ۳

ساجد محمود، نہم
۲۳، مارچ ۱۹۷۵ء
تجربات کرنا، انگلش
انجینئر۔

احمد پور لمہ تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خان

حلیمہ بائی کمپاؤنڈ رامسوامی نشتر روڈ کراچی ۳

محمد عمران حفیظ، ششم
۲۳، مارچ ۱۹۷۸ء
کرکٹ کھیلنا، ریاضی
پائیلٹ

مکان نمبر ۶۷۔ بی جنگی چوک حاصل پور

گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول گوادر بلوچستان

فہد حسن، ہشتم
۲۳، مارچ ۱۹۷۶ء
ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، سائنس
انجینئر۔

اے ۲۷۲، بلاک ڈی
ناریتھ ناظم آباد کراچی نمبر ۳۳

★ اس کالم میں انٹر تک کے طلبہ و طالبات شریک ہو سکتے ہیں ★ کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ★ خراب اور نامکمل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے ★ طالبات اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ----------	عمر ----------	جماعت ----------
مشاغل ----------		پسندیدہ مضمون ----------
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ----------	وجہ ----------	
پتہ ----------		

امّی ابّو کا صفحہ

محمد یوسف اصلاحی

گھر سے نکلے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے اور اب رہ رہ کر بوڑھی ماں کی یاد اور وطن کی محبت ستا رہی تھی اور یہی تمنا تھی کہ بوڑھی ماں سے زندگی میں ملاقات کا شرف حاصل کر سکوں اور میری پیاری ماں اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ کر باغ باغ ہو جائیں کہ پاک تمناؤں کا جو پودا انہوں نے لگایا تھا اور جس کی شادابی کے لئے انہوں نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تنہائی میں اپنے خدا کے حضور دامن پھیلا پھیلا کر اور آنسو بہا بہا کر دعائیں کی تھیں، آج وہی پودا خدا کے بے پایاں فضل، اور ان کی مقبول دعاؤں کی برکت سے دین و دنیا کے پھلوں سے لدا ہوا ہے۔

امام مالک رحمتہ اللہ نے یہ سنا تو تاکید فرمائی کہ شافعیؒ فوراً سفر کی تیاری کرو اور میں اس شان کے ہجوم شوق میں روانہ ہوا کہ میرے آگے پیچھے خراسانی گھوڑے اور مصری خچر، کپڑوں، غلوں اور درہم و دینار سے لدے ہوئے تھے۔ جب حدودِ حرم میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ عورتیں میرے انتظار میں کھڑی ہیں اور میری بوڑھی اور کمزور ماں بھی آغوش محبت پھیلائے مجھے گلے لگانے کے لئے بے تاب ہیں، جیسے ہی میں قریب پہنچا، گھوڑے سے نیچے اترا تو ماں نے گلے لگالیا اور دیر تک خوشی کے آنسو بہاتی رہیں، مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ غمزدہ سی ہیں، سب خوش ہیں مگر میری ماں کے چہرے پر نام کو بھی مسکراہٹ نہیں۔ جب کافی دیر ہو گئی تو میں آگے بڑھنے لگا۔ اور ماں سے بھی عرض کیا کہ چلئے اماں۔

بوڑھی ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولیں "بیٹے کہاں چلیں؟"

میں نے کہا اماں! گھر چلئے۔"

بولیں "بیٹے یاد ہے جب میں تجھے رخصت کر رہی تھی تو میرے پاس دو پرانی چادروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، اور میں نے تیرے شوق کو دیکھ کر وہی تیرے حوالے کیں اور اس طرح تجھے گھر سے روانہ کیا تو ایک فقیر تھا، اور اس آرزو کے ساتھ روانہ کیا کہ حدیث رسولؐ کی دولت سے مالا مال ہو کر لوٹے۔ بیٹے! یہ تو غرور کی پونجی ہے،..... کیا تو یہ سب اس لئے لایا کہ اپنے چچا کے بیٹوں پر اپنی بڑائی جتائے اور انہیں حقیر سمجھے؟"

میں بالکل خاموش کھڑا اپنی بوڑھی ماں کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا، اللہ اکبر..... دولت دنیا سے یہ بے نیازی، علم دین کی عظمت، خدا پر بھروسہ!

میرا دل عقیدت سے جھک گیا، اور میری آنکھیں گرم آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے جو کچھ ملا ہے، ماں کی مقبول دعاؤں اور پاک آرزوؤں کی بدولت ہی ملا ہے،

پھر نہایت عاجزی سے میں نے کہا "امی! فرمایئے اب میں کیا کروں؟"

بولیں "بیٹے کرنا کیا ہے، اعلانِ عام کر دے کہ بھوکے آئیں اور غلّہ لے جائیں، پیادے آئیں اور سواریاں لے جائیں، ننگے آئیں اور کپڑے لے جائیں، نادار آئیں اور دولت لے جائیں"۔ میں نے اسی وقت عام اعلان کرا دیا اور ذرہ دیر میں وہ ساری دولت معظّم کے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم ہو گئی۔ اب میرے پاس ایک خچر اور پندرہ دینار کے سوا کچھ نہ بچا تھا، ہم لوگ معظّم میں داخل ہوئے، اتفاق سے راستے میں میرا کوڑا گر گیا۔ ایک باندی پیٹھ پر مشک لادے جا رہی تھی، اس نے لپک کر کوڑا اٹھایا اور نہایت ادب سے میرے حوالے کیا۔

میں نے اس باندی کو انعام دینے کے لئے پانچ دینار نکالے تو ماں نے دیکھ کر کہا، بس بیٹے یہی پانچ دینار ہیں تیرے پاس؟"

میں "نہیں امی! ابھی دس اور ہیں۔"

امی "تو بیٹے وہ دس کس لئے رکھے ہیں؟"

میں "امی رکھ لئے ہیں کہ وقت بے وقت کام دیں گے اور غلہ بھی تو نہیں بچا ہے، شاید آج ہی ضرورت پڑے۔"

امی "ارے بیٹا تعجب ہے دس دینار پر تو اتنا بھروسہ اور سب کچھ دینے والے پر ذرا بھی بھروسہ نہیں، نکال سارے دینار اور اس باندی کے حوالے کر۔"

میں نے سارے دینار اس باندی کے حوالے کر دیئے..... اور اب میرا ہاتھ بالکل خالی تھا، لیکن دل ایسا غنی تھا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا غنی نہ تھا۔

ماں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بڑے پیار سے فرمایا "اب تو اسی حال میں اپنے چھونپڑے میں داخل ہو جس حال میں وہاں سے نکلا تھا، مگر آج میرے جھونپڑے میں وہ روشنی ہوگی جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بیٹے! خدا نے تیری پیشانی میں علم کا نور رکھا ہے، میں نہیں چاہتی کہ یہ نور دنیا کی فانی راحتوں سے دھندلا ہو، اور اس میں کمی آئے۔

بیٹے! تجھے یاد ہے میں نے رخصت کرتے وقت تجھے دعا دی تھی کہ خدا تجھے علم کے آسمان پر سورج بنا کر چمکائے۔ بیٹے! میں نہیں چاہتی کہ دنیوی مال و دولت کی بدلیوں میں اس سورج کی روشنی چھپی پڑے اور اسلامی دنیا اس سے روشن نہ ہو سکے۔"

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

لذّت بھی
توانائی بھی